مقابل ہے آئینہ

(پانچ اہم انٹرویو)

الطاف حسن قریشی

مکتبۂ اردو ڈائجسٹ، سمن آباد، لاہور

مقابل ہے آئینہ

(پانچ اہم انٹرویو)

الطاف حسن قریشی

مکتبہ اُردو ڈائجسٹ ــــ سمن آباد۔ لاہور

طابع ———— الطاف حسن قریشی
مطبع ———— اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز۔
سرکلر روڈ - لاہور
ناشر ———— مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ۔ سمن آباد۔ لاہور
طبع اوّل ———— جنوری ۱۹۶۹ء
تعداد ———— پانچ ہزار
قیمت ———— ۲٫۷۵ رُوپے

ترتیب

انتساب

والد مکرّم جناب عبدالغفار کے نام
جو مجھے بچپن میں
مولانا ظفر علی خاں کی جُرأت اور بیباکی کے واقعات سُنایا کرتے تھے۔

زنگار

خُدا کے فضل سے ہماری قوم ہنگامہ آرائی کے دَور سے گزر کر سنجیدہ غور و فکر کی منزلوں میں سفر کر رہی ہے۔ سوچ بچار سے افکارِ نو تخلیق ہوتے ہیں اور سچ پوچھیے تو افکار کی تازگی اور آزادی ایک زندہ قوم کی آبرو ہے۔

آبرو مند قوم اپنی تہذیب، اپنی روایات اور اپنے نظامِ زندگی کے بارے میں بڑی حسّاس اور بڑی چوکس ہوتی ہے۔ ان کی حفاظت سے اس کی اپنی وحدت اور سالمیت قائم ہے۔ اِن کے منتشر یا کمزور ہو جانے سے وہ خود بھی منتشر اور بے جان ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کے دانشور قوم کی نظریاتی سرحدوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور وہ اپنی سوسائٹی میں ایسے افکار کو راہ پانے نہیں دیتے جو قوم کی ہیئت ترکیبی کے تار و پود بکھیر ڈالے۔

پاکستانی قوم کو اپنے دانشوروں سے شکایات ہو سکتی ہیں، مگر تشکیل افکار کے عبوری دور میں اس قسم کی شکایت غالباً ہر قوم کو اپنے دانشوروں سے ہوتی آئی ہے اور میرے خیال میں یہ شکایت بھی دونوں طرف سے زندگی کی علامت ہے۔

ہم اس انتہائی نازک موقع پر جب قوم ایک دوراہے پر کھڑی ہے، ملت کی پانچ شخصیتوں کے افکار پیش کر رہے ہیں۔ "مقابل ہے آئینہ" ایک طرح کا فکری آئینہ ہے جس میں پاکستانی قوم اپنے مسائل کے خدوخال دیکھ سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ان شخصیتوں کی روداد زندگی میں یا اُن کے افکار میں فکری رہنمائی کے واضح نشانات مل جائیں یا یہ فکری رہنمائی کی نئی راہیں معلوم کرنے کی جستجو پیدا کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے سراب اور حقیقت کی سرحدیں واضح ہو جائیں اور ذہنی افق کے اندھیرے اور اُجالے زیادہ دیر تک آپس میں گڈمڈ نہ رہیں۔

سال نو کی طرح "مقابل ہے آئینہ" سے بھی سنجیدہ اور متوازن فکر کا جیتا جاگتا اور مسکراتا ہوا انقلاب رُونما ہو گا۔

۲۳ر دسمبر ۱۹۶۸ء — الطاف حسن قریشی

جسٹس حمود الرحمٰن

یہ انٹرویو ۱۸ اکتوبر ۷۴ء کو لاہور میں لیا گیا۔

دوسری طرف سے آواز آئی: "حمود الرحمٰن"

آواز میں بے پناہ پختگی اور وقار تھا، لیکن اس وقار میں یبوست نہیں تھی۔ وقار مسکرا رہا تھا اور اس میں اپنائیت کا عنصر غالب تھا۔

میں نے ہلکے سے تعارف کے بعد کہا:

"آپ سے انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

میں اس غیر متوقع "کیوں" پر ایک لمحے کے لیے لڑکھڑا گیا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ مجھے "کیوں" سے سابقہ پیش آئے گا، تو میں پہلے ہی سے کوئی جواب گھڑ رکھتا۔ مجھے اس وقت پہلی بار احساس ہوا کہ اس شخص پر کیا بیتتی ہے جسے شریر رپورٹر اچانک گھیر لیتے ہیں اور کپڑوں کے اندر سے جھانکنا شروع

کر دیتے ہیں۔ ہمارے ملک کے سیاست دان، چشمِ بد دُور، بڑے سمجھ دار ہو گئے ہیں، وہ ہر وقت اتنی تہیں چڑھائے رکھتے ہیں کہ کوئی کتنی ہی تاک جھانک کرے، اُسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔

مَیں "کیوں" کے ممکنات پر ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ جسٹس صاحب کی طرف سے لطیف قہقہہ بلند ہُوا۔ میرے سہمے ہوئے ذہن نے سنبھالا لیا۔

"مَیں تو ڈر ہی گیا تھا۔"

"ڈرنے کی تو کوئی بات نہیں۔ مَیں تو صرف یہ پُوچھ رہا تھا کہ کس جرم کی پاداش میں مجھ سے انٹرویو لیا جا رہا ہے۔"

"یہ کیا کچھ کم جرم ہے کہ آپ میں سوچ بچار کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔" مَیں اب بے تکلّف ہوتا جا رہا تھا۔

جسٹس صاحب کا شگفتہ لہجہ مجھے جرأت مند بنا رہا تھا۔ انہوں نے ۱۸ اکتوبر کو مغرب کی نماز کے بعد کا وقت دے دیا۔ ٹیلی فون بند کیا، تو دیر تک میرے کانوں میں جسٹس صاحب کی باتوں کا رس گھلتا رہا۔ یہ زبان، انسانی تعلقات میں کتنا اہم مقام رکھتی ہے۔ میٹھے بول دل جیت لیتے ہیں اور تحکمانہ الفاظ کی سختی کچھ دیر کے لیے خوف و ہراس پیدا کر دیتی ہے اور ماہرینِ نفسیات جانتے ہیں کہ انسان کی تمام خرابیوں کا منبع خوف ہے۔ عام طور پر ہم وقار اور رعب میں امتیاز نہیں کر پاتے اور اسی لیے ہمارے طرزِ عمل میں حُسن پیدا ہونے کے بجائے تصنّع کی کراہت پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ ہم سے دُور دُور رہنے لگتے ہیں۔ ہم اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ ہماری شخصیت بارعب ہے اور لوگوں کو ہمارے سامنے دم مارنے کا یارا نہیں۔

۱۸ اکتوبر کو مغرب کے بعد ہم اس علاقے سے گزر رہے تھے جہاں ہمارے "دماغ" رہتے ہیں۔ یہ علاقہ لاہور کے باقی تمام علاقوں سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ سبزہ، خنکی، نفاست اور رہنے والوں کا علوِ مرتبت دل کو متاثر اور ذہن کو مرعوب کر دیتے ہیں۔ اگر آپ کا ذہن مرعوب ہونے سے انکار کر دے، تو ہوا آپ سے زور آزمائی شروع کر دیتی ہے۔ ایک بار پہلے بھی وہ سُورج کے منہ آنی

تھی اور اب پھر سُورج کے دماغ سے ٹکرانا چاہتی ہے ۔ یا تو اسے بات یاد نہیں رہی یا ہمارے دماغ کا سُورج غروب ہو گیا ہے ۔

ہماری گاڑی ۱۱۔ ایمن روڈ پر آکر رُکی ۔ دو منزلہ عمارت سر اُٹھائے کھڑی تھی ۔ میں نے سوچا ہم سے اچھی تو یہ چُونے اور اینٹوں کی عمارت ہے جو کسی کے آگے جُھکنا نہیں جانتی ــــ اور ایک ہم ہیں کہ کبھی نفس کے آگے جھک جاتے ہیں ، کبھی مصلحتوں کو سلام کرتے ہیں اور کبھی انسان دشمن قوتوں کے آگے ہمارا سَر نگوں ہو جاتا ہے ۔ دو چار لمحے یہ خیالات طوفان اٹھاتے رہے ۔ اتنے میں چاند مسکراتا ہُوا نکلا ۔ وہ اس بات پر خوش تھا کہ انسان کو بھی سرنگوں ہونے کا احساس ہوا ہے ۔

جسٹس صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ میں نے ان کی باتوں سے ان کے متعلق جو تصوّر قائم کیا تھا ، وہ اس سے ملتے جُلتے تھے ۔ اُبھری ہوئی فراخ پیشانی ، شفّاف ذہن کی آئینہ دار تھی ۔ طبیعت کی شگفتگی ، چہرے کو شاداب کیے ہوئے تھی ۔ بڑی اور گہری آنکھوں سے بے پناہ وسعتِ نظر اور قوّتِ مشاہدہ کا احساس ہوتا تھا ۔ چہرہ انسانی کردار کا نہایت حسّاس آئینہ ہے ۔ بعض چہرے ماہ و سال کی گردش کے درمیان بھی معصوم سے نظر آتے ہیں ۔ اندر کی معصومیت چہرے میں منعکس ہوتی ہے اندر کی خباثت چہرے کے خدوخال کو یکسر بدل دیتی ہے ۔ اہلِ نظر دِل کی کیفیت چہرے سے بھانپ لیتے ہیں ۔

جسٹس صاحب سفید قمیص پاجامہ زیبِ تن کیے ہوئے تھے ۔ وہ ہمارے آنے سے پہلے کسی مقدمے کی فائل دیکھ رہے تھے ۔ انھوں نے ہمیں وہیں بٹھا لیا ۔ (ہمیں کا صیغہ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ ہم تعداد میں چار تھے) تعارف کی منزلیں طے ہوئیں ، تو جسٹس صاحب نے اصل گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا :

" الطاف صاحب ، کتنا اچھا ہو کہ آپ لوگ ہمیں گوشۂ عافیت ہی میں رہنے دیں ۔ ایک جج کو ان ہنگاموں سے دُور ہی رہنا چاہیے ۔ ' شہرت ' کی خواہش ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے ۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ جراثیم ہماری حفاظتی فصیلوں کو عبور کر آئے ، تو یہ معاشرے

کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ خدا شہرت کی ہوس سے ہم سب کو محفوظ رکھے"!

جسٹس صاحب نے جس دردمند لہجے میں یہ فقرے ادا کیے، مَیں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مَیں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ جسٹس صاحب کے لب جنبش میں آئے :

"انگلستان میں جج صاحبان بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔ وہ معاشرتی روابط سے گریز کرتے ہیں۔ انصاف کے تقاضوں کی خاطر وہ ازخود خاندان (FAMILY) کی چار دیواریوں میں مقید رہتے ہیں۔ وہ بڑی سختی سے ان روایات کی پابندی کرتے ہیں جو صدیوں سے چلی آرہی ہیں"۔

"لیکن جسٹس صاحب، ہمارے انٹرویو کا مقصد شہرت کے رجحان کو تقویت پہنچانا نہیں ہے۔ ہم تو آپ کے پاس صرف اس لیے آئے ہیں کہ ہمارے دانشوروں کے ذہنوں میں جو مسائل اُبھر رہے ہیں، ان کے بارے میں آپ سے رہنمائی حاصل کی جائے"۔

"کیا واقعی ہمارے ہاں کے دانشوروں نے سوچنا شروع کر دیا ہے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"انہوں نے سوچنا بند کب کیا تھا۔ انہیں قوم کا غم ہر لحظہ بے چین رکھتا ہے۔ اب تو ان کی بے چینی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ بہت سے لوگ ان کے متعلق بے چین رہنے لگے ہیں"۔

ہماری سنجیدہ گفتگو پر کمرے نے بھی سوچنا شروع کر دیا تھا۔

"آپ کے خیال میں ایک آئیڈیل جج کن صفات کا حامل ہوتا ہے"؟

"آئیڈیل جج کی صفات کا جو سب سے واضح خاکہ ہمیں اسلامی لٹریچر سے ملتا ہے، وہ کہیں اور سے نہیں ملتا۔ ایک آئیڈیل جج کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں خدا کی رہنمائی کا طالب ہو۔ وہ اپنی تمام صلاحیتوں اور قوتوں کو قیامِ عدل کے لیے بروئے کار لائے اور اس کے ذہن میں یہ حقیقت پوری طرح راسخ ہو کہ خدا ان کو اپنا راستہ دکھاتا ہے جو اس کے راستوں کو پالینے کی جدوجہد کرتے ہیں۔

"ایک اچھے جج میں آخرت کی جواب دہی کا احساس بہت پختہ ہونا چاہیے۔ یہ احساس، اسے حرص و ہوا اور خوف و خطر کے تمام مشکل اور نازک مقامات سے بالاتر کر دے گا۔ خدا کے سامنے پیش ہونے کا تصوّر اس کے ضمیر کو زندہ رکھے گا اور وہ پامردی کے ساتھ ان تمام رکاوٹوں کو دُور کرتا ہُوا آگے بڑھتا رہے گا جو انصاف کے راستے کو بند کرتی ہوں۔

"ایک اچھے جج کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا تعلق اس خاندان سے ہو جس کے دامن میں عمدہ روایات ہوں اور اس کی اپنی شخصیت باوقار اور لوگوں میں کردار کے اعتبار سے بھی پسندیدہ ہو۔

"اور یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں کہ اس میں اتنی قوتِ برداشت ہو کہ وہ فریقین کے دلائل تحمل سے سُن سکے اور بردباری کے ساتھ معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

"ججوں میں اچھی صفات اس وقت پیدا ہو سکتی ہیں جب کہ وہ آسودہ حال ہوں، ان کا مرتبہ اتنا بلند ہو کہ وہ اس سے نیچے اترنا بھی چاہیں، تو نہ اتر سکیں، سوسائٹی میں ان کے لیے احترام ہو تاکہ وہ احترام انہیں اپنے منصب کی نزاکت اور عظمت کا احساس دلاتا رہے۔"

ان کا چہرہ یکایک سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"کیا ہمارے معاشرے میں عدلیہ کے لیے وہ احترام پایا جاتا ہے؟" مَیں نے نہ جانے یہ سوال کیسے پوچھ لیا۔

"یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ سوسائٹی ہم پر اعتماد کرتی ہے۔ اعتماد ہی کے منبع سے احترام کا چشمہ پھوٹا کرتا ہے۔"

"جسٹس صاحب،" مَیں نے رُکتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس نئی پود سے جو لوگ جج بنیں گے، وہ اِس منصب کے وقار اور اس کی عظمت کی حفاظت کر سکیں گے"؟

ان کی انگلیاں سر کے بالوں کو چھو رہی تھیں۔ ایک دو لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے فرمایا،

"اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی پود میں ذمّہ داری کا احساس کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی اخلاقی توانائیاں کمزور پڑتی جا رہی ہیں، لیکن جب تک ججوں کا انتخاب بار (BAR) سے ہوتا رہے گا، اس وقت تک عمدہ معیار قائم رہے گا۔ اس سلسلے میں موجودہ ججوں پر نہایت اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انہیں اچھی مثالوں اور اچھی روایات کے ذریعے اچھے لوگ تیار کرنے ہوں گے۔ دوسری طرف بار کو جاندار، جرأت مند اور حق شناس ہونا چاہیے۔ نیم جاں بار کس کام کی؟"

اتنے میں چائے آگئی اور چائے پیتے ہوئے مَیں نے یوں محسوس کیا جیسے میرے ذہنِ مردہ میں جان سی پڑ گئی ہے ـــــ لیکن دوسرے ہی لمحے میرا ذہن شدید ردِّعمل کی لپیٹ میں تھا۔ خارجی عوامل سے زندگی اور حرارت حاصل کرنا میری انا کی توہین ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ میرے اندر کا انسان مرگیا ہے۔ نہیں، نہیں، مَیں کسی سے مدد نہیں لوں گا، مَیں اسے خود زندہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ مَیں دوسروں کے سہارے زندہ رہوں۔

یہ چمچوں کی جھنکار نے تحت الشعور کو مرتعش کر دیا۔

"جسٹس صاحب، آپ نے ابھی فرمایا ہے کہ ہماری نئی نسل میں ذمّہ داری کا احساس کم ہے۔ آپ نے یہ بات کس بنیاد پر کہی؟"

"بنیاد — عام مشاہدہ اس کی بنیاد ہے۔ میں مارشل لا کے دوران میں دو سال ڈھاکہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر رہا ہوں۔ مجھے اس عرصے میں نوجوان طلبہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مَیں ان کی گمراہی اور بے راہروی کو دیکھ کر اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ کیا ہم نے اسی لیے یہ خطہ زمین حاصل کیا تھا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ مقاصد پامال ہوتے رہیں جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ مذہب سے گریز، اخلاقی نظم سے فرار، زندگی کے بارے میں غیر سنجیدہ روّیہ، غرض اسی قسم کے رجحانات سوسائٹی میں راہ پا رہے ہیں۔"

"جن خرابیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، کیا وہ عام لوگوں میں پائی جاتی ہیں یا ایک خاص طبقے تک

محدود ہیں؟"

"یہ خرابیاں ان لوگوں میں ہیں جو دانشور کہلاتے ہیں اور جن کے ذمے گلشنِ ذہن کی نگہداری ہے۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہمارے ذہین طبقے کی یہ کیفیت کیوں ہے؟"

"سب سے بڑی وجہ ——" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: "یہ ہے کہ گھر کی تعلیم و تربیت بہت ناقص ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ ہم پڑھائی کا آغاز عربی کے قاعدے سے کرتے تھے۔ گھر کی سب سے بزرگ اور ضعیف عورت ہماری استاد ہوتی تھی۔ جب قرآن مجید کے ایک دو پارے ختم کر لیتے تھے، تو پھر ہمیں کسی مدرسے میں داخل کیا جاتا تھا۔ مدرسے کی تعلیم کے دوران میں قرآن کی تدریس و تعلیم کا سلسلہ قائم رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اتوار کو سکول سے چھٹی ہوتی اور ہماری والدہ ہمیں پیار سے قرآن پڑھنے کے لیے بٹھا لیا کرتی تھیں۔ پھر ہمارے چچا ہمیں باقاعدگی سے اپنے ساتھ مسجد میں لے جایا کرتے تھے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اُس وقت مسجد سے جو ایک تعلق پیدا ہوا تھا وہ آج بھی موجود ہے۔ اب ہمارے معاشرے میں یہ کیفیت کہاں! چونکہ بچّہ اپنی زندگی کے ابتدائی مرحلوں میں خدا اور رسولؐ سے تعلّق کا بہت کم مشاہدہ کرتا ہے، اُس لیے اُس کی جوانی پاکیزہ نقوش سے خالی رہتی ہے۔ جوانی تو ویسے بھی خود سر اور الھڑ ہوتی ہے۔"

جسٹس صاحب کی باتوں نے مجھے اپنا ماضی یاد دلا دیا۔ واقعی وہ کیا دن تھے! ہمارے گھر میں سب صبح سویرے اٹھ جایا کرتے تھے۔ والدہ صاحبہ تہجد کے لیے بہت خاموشی سے اٹھا کرتی تھیں۔ صبح کی اذان کے وقت وہ ہم بچّوں کو جگا دیتی تھیں۔ سردی ہو یا گرمی، نماز کے لیے مسجد میں جانا ضروری تھا۔ نماز کے بعد ہم سب بھائی بہت ہی مشفق قاری صاحب سے قرآن پڑھتے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد مسجد سے آتے، سادہ سا کھانا کھاتے اور سکول چلے جاتے۔ سکول سے واپس آتے، کچھ دیر کھیلتے کودتے اور پھر عصر کی نماز کے بعد قاری صاحب کے پاس قرآن حکیم پڑھنے کے لیے چلے جاتے۔ ہم پر ہمارے والدین نے کتنا بڑا احسان کیا ہے، جب یہ سوچتا ہوں، تو بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ اگر

بچپن اور لڑکپن میں ہمیں ان کی رہنمائی حاصل نہ ہوتی، تو معلوم نہیں آج ہم کس ڈگر پر ہوتے۔ اگرچہ زندگی میں وہ پہلی سی پاکیزگی نہیں رہی، لیکن پاکیزہ رہنے کا جو احساس والدین نے میری گھٹی میں ڈال دیا تھا، وہ ابھی تک ہے۔

جسٹس صاحب یہ باتیں اُردو میں کر رہے تھے۔ زبان کی شستگی اور لہجے کی دلکشی عجب لطف دے رہی تھی۔ میں نے پوچھ ہی لیا:

"اتنی پیاری اُردو زبان آپ نے کہاں سے سیکھی ؟"

"ہمیں اُردو زبان کہاں آتی ہے۔ بڑی تمنا ہے کہ کچھ آجائے۔ یہ جو ٹوٹی پھوٹی زبان بول لیتا ہوں یہ خاندان سے ورثے میں پائی ہے۔ یوں تو عمر کا بڑا حصّہ انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کی تحصیل میں گزرا، لیکن گھر میں عربی، فارسی اور اردو کا جو ذوق پیدا ہو گیا تھا، اس کا ابھی کچھ اثر باقی ہے۔"

جسٹس صاحب کا انکسار بے حد پسند آیا۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ثمردار شاخیں جھکی رہتی ہیں۔

"آپ نے کبھی اس پہلو پر غور فرمایا کہ آج کے والدین اپنے بچّوں کی صحیح تعلیم و تربیت سے بے پروا کیوں ہیں ؟"

ان کی آنکھیں ایک دو لمحوں کے لیے بند ہوئیں اور پھر انہوں نے فیصلہ کُن انداز میں کہا:

"مجھے مغربی پاکستان کے متعلّق زیادہ معلومات حاصل نہیں۔ مشرقی پاکستان کے بارے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ بے پروائی ایک عرصے سے چلی آ رہی ہے۔ عہدِ غلامی میں متوسط طبقہ اور اونچا طبقہ اپنے بچّوں کو انگریزی سکولوں میں بھیجنے لگا تھا، کیونکہ ان سکولوں سے باہر معاش کے دروازے بند تھے۔ غریب طبقہ زندگی اور مَوت کی کشمکش سے دوچار تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اس صورتِ حال میں نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ غربت و افلاس کا مقابلہ کرنے کے لیے میاں بیوی کام پر نکل جاتے ہیں، بچّوں کی تربیت کون کرے ؟"

"لیکن جسٹس صاحب، یہ غربت تو آج سے پچاس سال پہلے بھی موجود تھی، مگر اس وقت

ماں باپ بچوں کی مذہبی تعلیم سے اتنے بے پروا نہیں تھے، بلکہ مشاہدہ تو یہ بتاتا ہے کہ مفلسی میں مذہب سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے۔"

جسٹس صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ان کی ژرف بین نگاہیں عالمِ تصوّر میں اسباب کا کھوج لگا رہی تھیں۔ سوچ کی گہرائیوں سے اُبھرتے ہوئے فرمایا :

"میرا خیال ہے کہ اس صورتِ حال کو جنم دینے میں غیر اسلامی ثقافت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے ہماری ثقافت پر بھرپور وار کیے اور غیر شعوری طور پر ہمارا اپنی ثقافت سے رشتہ ٹوٹتا چلا گیا۔ مغربی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ مغربی افکار و نظریات سوسائٹی میں راسخ ہوتے چلے گئے۔ مجھے اب احساس ہوتا ہے کہ میرے چچا اسلامی ثقافت کے بارے میں جو اتنے متشدّد تھے، وہ بالکل صحیح راستے پر تھے۔ میرے بھائی اور میرے چچا نے اگرچہ انگریزی علوم سے خوب استفادہ کیا، لیکن وہ انگریزی لباس نہیں پہنتے تھے۔ میرے چچا کہا کرتے تھے کہ نکٹائی عیسائیوں کے کراس کا مظہر ہے۔ میں نے بعد میں ٹائی کے بارے میں تحقیق کی، تو معلوم ہُوا کہ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ ٹائی کی تاریخ روم سے شروع ہوتی ہے۔ اہلِ روم عیسائیوں سے امتیازی سلوک کرتے تھے۔ انہیں سوسائٹی سے تمیز کرنے کے لیے یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے گلے میں رسّیاں ڈالا کریں۔ ایک مدّت تک عیسائی یہ رسّیاں باندھتے رہے۔ بعد میں فرانس کے ایک پادری نے یہ تجویز رکھی کہ ان رسیوں کی جگہ رومال باندھے جائیں کہ کراس کا نشان بن جائے۔ اس رومال کو فرانسیسی میں (CRAVAT) کہا جاتا تھا۔ ہمیں ایسی تصویریں ملتی ہیں جن میں عیسائی یہ رومال باندھے ہوئے ہیں۔ بعد میں یہ رومال، ٹائی کی شکل اختیار کر گیا۔ ہمارے بزرگ اس لطیف نکتے سے واقف تھے کہ جب ایک مفتوح قوم فاتح قوم کے علوم و فنون سیکھنے لگتی ہے، تو وہ آہستہ آہستہ ایک طرف اپنے علوم و فنون سے بے اعتنائی اختیار کرتی چلی جاتی ہے اور دوسری طرف غیر شعوری طور پر فاتح کی تہذیب کو قبول کرتی جاتی ہے، اسی لیے یہ بزرگ انگریزی طور طریقے اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ

روک سکتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، بزرگوں کی قوت کمزور ہوتی گئی اور غیر اسلامی تہذیب کا سیلاب حفاظتی بندوں کو توڑتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔"

"جسٹس صاحب، آپ نے ابھی غیر اسلامی ثقافت کا لفظ استعمال کیا ہے، کیا اسلام بھی ثقافت کا کوئی تصوّر رکھتا ہے؟"

"اگر ثقافت سے مراد فنونِ لطیفہ ہے، تو مسلمان بہت سی اقوام کا مجموعہ ہیں اور ہر قوم کے اپنے اپنے طور وطریق ہیں، لیکن اگر ثقافت سے مراد طریقِ زندگی ہے، تو پھر بے شک اسلام بھی ایک ثقافت ہے، کیونکہ اسلام ہمیں ایک منفرد طرزِ زندگی اور جداگانہ دستورِ حیات دیتا ہے۔ اسلامی ثقافت کا منبع، قرآن وسنّت ہے اور سچ پوچھیے تو یہی ثقافت ہماری زندگی اور آزادی کا سرچشمہ ہے۔ ہم میں اپنی ثقافت کو زندہ رکھنے کا جتنا بھرپور احساس ہوگا، ہم اتنی ہی قوّت سے عظمت کی طرف بڑھیں گے۔"

"کیا اسلامی ثقافت میں رقص کی بھی گنجائش ہے؟"

"رقص، بالخصوص خواتین کا رقص اسلام کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ نظریاتی گفتگو سے ہٹ کر جب ہم تاریخی عمل کا جائزہ لیتے ہیں، تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلم ذہن نے رقص کو کبھی قبول نہیں کیا اور اسی وجہ سے مسلمانوں میں رقص ایک فن کی حیثیت اختیار نہ کر سکا۔ ہمارے پاکستان میں جتنے رقاص یا رقاصائیں ہیں، انہوں نے رقص کے تمام پیچ وخم ہندوؤں سے یا مغربی اقوام سے لیے ہیں۔ جو مذہب مردوں کو یہ حکم دیتا ہو کہ اگر ان کی نظر کسی عورت پر پڑ جائے، تو وہ اپنی نظریں نیچی کر لیں، بھلا وہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ مردوں کے سامنے عورتوں کا ایک ایک انگ تھرک کر عریاں ہو۔"

"لیکن جسٹس صاحب، اہلِ فن کہتے ہیں کہ اب آرٹ نے نظر کو اتنا لطیف بنا دیا ہے کہ وہ صرف پاکیزگیٔ حسن کو جذب کرتی ہے۔"

"الطاف صاحب، یہ کھلا نفاق ہے۔"

کتنی سیدھی سادی ہے یہ ثقافت! میں نے اپنے دل میں کہا۔ اس ثقافت کے تحت جو زندگی گزرے گی، اس میں کیا لذت ہو گی! نظر تشنہ تشنہ اور ذہن بجھا بجھا سا رہے گا، زندگی کی ساری رنگینی ختم ہو جائے گی اور لطیف ذوق دم توڑ دے گا۔

گفتگو ثقافت سے پھسل کر طلبہ کے مسائل تک جا پہنچی۔ اب تک کی باتیں اتنی دلچسپ تھیں اور حمود الرحمٰن صاحب کا اندازِ بیان اتنی جاذبیت رکھتا تھا کہ ہمیں وقت کے گزرنے کا قطعاً کوئی احساس نہ ہوا۔ گھڑی دیکھی، دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب مسائل کو سمیٹنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے طلبہ کے بارے میں سوال کیا:

"ہم طلبہ کی بے چینی کیوں کر دُور کر سکتے ہیں اور انہیں اسلام کے قریب لانے کے لیے ہمیں کیا اقدامات کرنے چاہئیں"؟

"طلبہ میں اسلامی ذہن اب وعظوں کے ذریعے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اس مقصد کے لیے جدید طریقے اختیار کرنے ہوں گے۔ اب سیمیناروں، مذاکروں اور مباحثوں کا دَور ہے۔ ہمیں ان مذاکروں اور مباحثوں میں اسلامی موضوعات پر گفتگو کرنی چاہیے، ہمیں ایسا لٹریچر تیار کرنا ہو گا جس کے ذریعے ہم یہ بتا سکیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ ہمیں اپنے اسلاف کے علمی اور سائنسی کارناموں کو اُجاگر کرنا ہو گا اور یہ دکھانا ہو گا کہ تشکیلِ انسانیت میں انہوں نے سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ دراصل ہماری نئی نسل اسلاف کی عظمت سے بالکل ہی بے خبر ہے۔ ان تمام باتوں سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنے عمل سے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کریں۔ اسلام کے نام لینے والے تو ہمارے ہاں بہت ہیں، لیکن اسلامی اخلاق کے نمونے کہاں نظر آتے ہیں۔

"طلبہ کی بے چینی کو معقول طریقوں سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ اگر طلبہ سے ہمدردی اور معقولیت کا رویّہ اختیار کیا جائے، تو نتائج حوصلہ شکن نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں سب سے اچھا اصول یہ ہے کہ جن لوگوں کے معاملات طے کرنے ہوں، انہیں اعتماد میں لیا جائے اور ان سے مشورہ

کیا جائے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب میں نے طلبہ کو سمجھایا کہ ان کا نقطۂ نظر غیر منطقی اور خود ان کے خلاف جاتا ہے، تو وہ معقول بات ماننے کے لیے تیار ہو گئے۔ جو شخص بچوں کے لیے اپنے دل میں محبت کا گہرا جذبہ رکھتا ہو، طلبہ کی نفسیات پر اس کی نظر ہو، آنے والے حالات کا اندازہ لگا لینے کی صلاحیت ہو، اس کے مزاج میں برہمی اور اشتعال نہ ہو اور نظم و ضبط کے بنیادی اصولوں سے پوری طرح آگاہ ہو، وہ طلبہ کے مسائل کو بہ حسن و خوبی حل کر سکتا ہے۔"

جسٹس صاحب نے تین چار فقروں میں اپنے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ پیش کر دیا۔ یہ تین چار فقرے ان کے حقیقت پسندانہ اندازِ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ ان کے الفاظ پر جتنا غور و فکر کریں گے معانی کی تہیں کھلتی چلی جائیں گی۔

جسٹس صاحب کے خیالات کی گہرائی اور گیرائی سے لطف اٹھاتے ہوئے میں نے ایک گہری بات پُوچھ لی:

"کیا آپ اہلِ علم و فضل کو اس بات کی مکمل آزادی دینے کے حق میں ہیں کہ وہ ذہنی ریاضت کے ذریعے جس نتیجے پر پہنچیں، اس کا برملا اظہار کر سکیں؟"

"ہم اربابِ علم و فضل کو لامحدود آزادی نہیں دے سکتے۔ ریاست کی آئیڈیالوجی کے دائرے میں رہ کر وہ ذہنی ریاضت پوری آزادی کے ساتھ کر سکتے ہیں، لیکن کوئی ریاست کسی ذی علم کو اس بات کی آزادی نہیں دے سکتی کہ وہ اپنی تحقیق سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دے جس پر ریاست کی عمارت کھڑی ہے۔ پاکستان میں ہم ایسی ذہنی ریاضت کی مکمل آزادی نہیں دے سکتے جو ہمارے عقائد اور ہمارے اساسی نظریات کے خلاف ہو۔ جس طرح جسم کو ہوا، پانی اور خوراک کی ضرورت ہے، بالکل اسی طرح روح کو اپنی بقا کے لیے ایمان کی ضرورت ہے۔ عقیدے کے بغیر کوئی معاشرہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ جاپان کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ وہ اپنے شہنشاہ کو خدا کا اوتار سمجھتے تھے۔ یہ شہنشاہ پوری قوم کو زندگی، تازگی اور عزمِ راسخ عطا کرتا تھا، لیکن جب سے

شہنشاہ نے میکارتھر کے آگے ہاتھ جوڑے ہیں، اہلِ جاپان کا عقیدہ متزلزل ہوگیا ہے۔ وہ بے یقینی اور ذہنی انتشار کے گرداب میں ہیں۔ اسلام اہلِ پاکستان کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر قوت ہے۔ ہم ذہنی رِیاضت اور ذہنی آزادی کے نام پر اس قوّت کو کمزور کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

رات کے نو بجنے والے تھے، لیکن ابھی یوں لگتا تھا جیسے ہمیں آئے ہوئے آدھ گھنٹہ ہی ہوا ہے۔ باتیں شگفتہ ہوں، تو وقت بھی سُبک خرام ہو جاتا ہے۔ میں نے شگفتہ ماحول میں ایک سنجیدہ سوال کر دیا:

"قانون کی تعبیر کے وقت آپ کن امور کا خیال رکھتے ہیں"؟

"بڑا نازک سوال کیا ہے آپ نے۔ نازک ان معنوں میں کہ تعبیر کا لفظ شیشے کی مانند نازک ہے، ذرا ٹھیس لگی اور کچھ کا کچھ ہو گیا۔ مختصر الفاظ میں، مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ قانون بنانے والوں کا قانون بنانے سے کیا منشا تھا اور انہوں نے اپنی منشا کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے، ان کے معروف معنی کیا ہیں، یعنی عام طور پر ان الفاظ سے کیا معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ قانون فطری انصاف کے تقاضے کس حد تک پورا کرتا ہے۔"

"یہ فطری انصاف کیا ہے"؟

"فطری انصاف ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے ممکنات کا ابھی تک احاطہ نہیں ہو سکا، لیکن اس میں تین باتیں واضح طور پر شامل ہیں۔ کسی ملزم کو صفائی کا موقع دیے بغیر سزا نہ دی جائے۔ جس مقدمے میں جج کا کوئی مفاد ہو، اُس مقدمے کی سماعت وہ جج نہ کرے۔ مقدمے کے فیصلے کے خلاف ملزم کو اپیل کرنے کا حق ہو۔ یہ وہ اصول ہیں جو ایک اچھے قانون کے بنیادی نکات ہیں۔ ہر مہذب معاشرے میں فطری انصاف کے اصولوں کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔"

جسٹس صاحب نے آخری فقرہ مکمل کیا تھا کہ میرے چنچل ذہن نے ایک نہایت ہی خطرناک سوال کو جنم دیا:

"جب آپ عدالت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں، تو کیا محسوس کرتے ہیں"؟

"کچھ نہ پوچھو، وہ کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ معلوم نہیں اس کرسی میں کیا ہے۔ ذمہ داری کا احساس منصب کی نزاکت اور خدا کے سامنے جواب دہی کا تصور، ضمیر میں کانٹے کی طرح چبھتے ہیں۔ مظلوم جب ہمارے پاس دادرسی کے لیے آتا ہے، تو احترامِ انسانیت کا شعور چراغ کی لو بن جاتا ہے۔ اس نوع کے مقدمات میں راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں، ایسے میں خدا کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے نگاہیں بار بار اُوپر اُٹھتی ہیں اور مَیں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ خدا رہنمائی کرتا ہے۔ دل کا سکون تو اسی کی ذات سے ملتا ہے۔ مَیں سوچتا ہوں کہ اگر ہم ایمان کی دولت سے محروم ہوتے، تو ہماری کیا حالت ہوتی۔"

جسٹس صاحب کی آواز میں دھیما پن آگیا تھا، جیسے لذّتِ بندگی نے انہیں بے خود سا کر دیا ہو۔ ان کی آنکھوں میں نیازمندی کا سرور تھا اور رات کی خاموشی میں زمزمۂ دل صاف سنائی دے رہا تھا۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے!

"جسٹس صاحب، وکلا کی طول طویل قانونی بحثوں میں سے گزر کر آپ انصاف تک کیسے پہنچتے ہیں؟"

"میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ خدا ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ دراصل مقدمات کے مختلف مراحل طے کرنے سے ہمارا ایک ایسا مزاج بن جاتا ہے جسے ہر وہ بات کھٹک جاتی ہے جو انصاف کے خلاف ہو، اگرچہ فریقین قانون کو عجب عجب رنگ دیتے ہیں، لیکن ہمارے مزاج کا سانچہ عموماً صحیح بات ہی کو قبول کرتا ہے۔ صحیح نتیجے تک پہنچنے میں وجدان کو بڑا دخل ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ایک مقدمے میں فریقین کے دلائل سننے کے بعد مَیں ایک نتیجے پر پہنچ گیا اور جب مَیں فیصلہ سنانے ہی والا تھا، وجدان نے ذہن میں خلش پیدا کر دی۔ میں نے فیصلہ محفوظ رکھا اور رات کو ریکارڈ کا ازسرِ نو مطالعہ کیا۔ مطالعے کے بعد میری رائے تبدیل ہو گئی۔"

ساڑھے نو بج چکے تھے، مَیں نے ایک اور سوال کیا:

"کیا عدلیہ نے جمہوری اقدار کے فروغ میں حصہ لیا ہے؟"

"جمہوریت کے ارتقا میں عدلیہ نے ہر ملک میں قابلِ قدر کردار ادا کیا ہے۔ یہ عدالتیں شہریوں کے

حقوق کی حفاظت کرتی ہیں، عوام کی خواہش کو قانون کی شکل میں نافذ کرتی ہیں۔ ہمارے فیصلے جمہوریت کی رُوح کو تقویت پہنچاتے ہیں اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ رُک گئے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے:

"میری دلی تمنا ہے کہ ججوں کے لباس میں کچھ اس طرح کی تبدیلی کی جائے کہ وہ اسلامی روایات کا حامل بن جائے۔ یہ جو ہم بینڈ لگاتے ہیں، خاصا تکلیف دہ ہے۔ اہلِ حیدر آباد (دکن) اگر ججوں کے لباس میں تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں، تو پاکستان ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ گاؤن بڑی آسانی سے چوغہ بن سکتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی ثقافت کا اظہار ہونا چاہیے۔ مَیں تو اس بات کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔"

"اب ہمیں کچھ اپنے حالاتِ زندگی بھی سُنائیے۔" میں نے گفتگو کو ایک نیا رُخ دیا۔

"زندگی کی مختصر رُوداد یہ ہے کہ مَیں ۱۹۱۰ء میں پٹنہ کے مقام پر پیدا ہُوا۔ میرے والد محترم داؤد الرحمٰن بنگال، بہار اور اُڑیسہ میں پہلے مسلمان سول سرجن تھے۔ مَیں ابھی چار پانچ سال ہی کا تھا کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ میرے چچا شمس العلما عطاء الرحمٰن اور میرے بڑے بھائی وُدُو الرحمٰن میری نگہداشت کرتے رہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مجھے کلکتہ کے ایک مشہور انگریزی سکول میں داخل کر دیا گیا۔ اس سکول میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے مزاج کو ایک خاص رنگ میں ڈھال دیا۔"

اس اہم واقعے کو سننے کے لیے ہم گوش بر آواز بنے ہوئے تھے۔ ہر لمحہ ہمارے شوق کو تیز کر رہا تھا۔

"وہ واقعہ یہ تھا کہ ہم جماعت کے کمرے میں تھے۔ فادر سبق پڑھا رہا تھا۔ سبق کے دوران میں فادر نے کہا کہ وکٹوریہ میموریل، تاج محل سے زیادہ خوبصورت ہے۔ مَیں اپنی سیٹ پر کھڑا ہو گیا اور فادر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

"فادر، تم نے تاج محل نہیں دیکھا، اس لیے وکٹوریہ میموریل کا تاج محل سے مقابلہ نہ کرو۔ میموریل کو تاج محل سے کیا نسبت"؟

فادر کو غصّہ آ گیا اور اس نے مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ میں مار کھاتا رہا، مگر میری زبان پر یہی الفاظ تھے کہ میں آپ کی اس مار سے غلط بات کو صحیح نہیں مان سکتا۔ مجھ میں اسی روز سے ہٹ دھرمی کا دلیہ مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ اس واقعے نے مجھے آئندہ کی زندگی میں تشدّد کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کیا اور میں نے زندگی کے ہر محاذ پر تشدّد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اسی فادر کے کردار کا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیجیے۔

اگلے سال فادر تاج محل دیکھنے کے لیے گیا اور اس نے واپس آ کر بھری کلاس میں مجھ سے معافی مانگی اور اس بات کا اعتراف کیا کہ تاج محل، میموریل سے بہت زیادہ خوبصورت ہے۔ فادر کے اس اعتراف نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں اس بنا پر اس سے بے پناہ محبت کرنے لگا۔

پہلی بار ۱۹۳۰ء میں انگلستان گیا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک وہاں رہا۔ میں وہاں بیرسٹری کے لیے گیا تھا۔"

"کیا انگلستان کے قیام نے آپ کے ذہنی اُفق پر کسی قسم کے ذہنی اثرات مرتب کیے؟"

"جی ہاں، سب سے زیادہ مجھے وہاں کی سادگی پسند آئی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی دفعہ کلاس کے کمرے میں گیا، تو میں نہایت بیش قیمت سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ میرے برابر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا:

"کس کی شادی میں جا رہے ہو؟"

"یہ الفاظ بجلی بن کر گرے۔ میں پیریڈ ختم ہوتے ہی گھر آیا اور سادہ کپڑے پہنے۔ میں نے وہاں دیکھا کہ بڑے سے بڑے باپ کا بیٹا سادہ کپڑے استعمال کرتا تھا۔ دوسری قابلِ ذکر بات لوگوں کی دیانت داری تھی۔ ہمیں دستانے اور چھتری استعمال کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہاں یہ چیزیں استعمال کرنا پڑیں مگر ہوتا یہ تھا کہ جس جگہ جاتے، ان میں سے کوئی نہ کوئی چیز بھول آتے۔ جب یاد آتا، دکان پر جاتے، اور وہ چیزیں مل جاتیں۔ یہ دیانت داری صرف عیسائیوں تک محدود تھی۔ یہودیوں کا طرزِ عمل اس سے

بالکل مختلف تھا۔ وہ شوکیس میں عمدہ چیزیں کم قیمت لکھ کر رکھ دیتے تھے، لیکن وہ چیز دکان کے اندر کبھی نہیں ملتی تھی۔ انگلستان کی عدلیہ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میرا زیادہ وقت عدلیہ کے نظام کو دیکھنے میں گزرا۔ میرا اس وقت یہ احساس تھا کہ انگلستان کی عدلیہ دنیا کی بہترین عدلیہ ہے۔ میرا عدلیہ کے بارے میں اب بھی یہی احساس ہے، تاہم اب ان کی اخلاقی حالت پہلے جیسی نہیں رہی۔"

جسٹس صاحب، ان میں یہ تغیّر کیوں ظہور پذیر ہوا؟

"میں قطعیت کے ساتھ تو کوئی بات نہیں کہہ سکتا، تاہم میرا خیال ہے کہ اُس وقت ان میں مادی ترقّی کے بعد اخلاقی اور روحانی پاکیزگی حاصل کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ وہ اپنے اندر وہ صفات پیدا کرنا چاہتے تھے جو قوموں کو فتح مندیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار کیا کرتی ہیں ــــ لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا یہ جذبہ سرد پڑ گیا ہے اور ان کی تہذیب کی بنیادی خرابیاں اُبھر کر سامنے آ گئی ہیں۔"

جسٹس صاحب نے زندگی کے حالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بتایا:

"۴۵/۱۹۴۴ء میں پاکستان کی تحریک شدّت اختیار کر گئی تھی۔ میں نے اس تحریک میں سرگرم حصّہ لیا۔ قائداعظمؒ کو کئی بار قریب سے دیکھا۔ وہ جب بھی کلکتے آتے، میں زیادہ وقت ان کی خدمت میں رہتا۔ انہیں سب سے زیادہ قریب سے دیکھنے کا اس وقت موقع ملا جب فضل الحق نے قائدِاعظم خواجہ ناظم الدین اور سہروردی کے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا۔ مجھے قائدِاعظم کی طرف سے پیش ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مقدمہ میری زندگی میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔"

"جسٹس صاحب، آپ نے قائدِاعظمؒ کی شخصیت میں سب سے نمایاں بات کیا دیکھی؟"

"مقصد کے لیے اخلاص۔ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس پر ڈٹ جاتے تھے۔ پھر انہیں بڑی سے بڑی طاقت ایک انچ بھی نہیں ہٹا سکتی تھی۔ یہی ان کی عظمت تھی۔"

وہ آگے بڑھے: "پاکستان بننے کے بعد مجھ سے بہت سے لوگوں نے کہا کہ تم کلکتے ہی میں

رہو۔ ہندوؤں کے سربرآوردہ لیڈر کئی بار میرے پاس آئے، لیکن میں نے ان کرم فرماؤں سے کہہ دیا:
"ہر وہ لمحہ جو میں ہندوستان میں گزار رہا ہوں، اس میں موت کے قریب ہوتا جا رہا ہوں۔"

"میں نے وکالت میں اپنا ایک اصول بنا لیا تھا کہ میں فیس ۱۰۵ روپے سے زیادہ لوں گا نہ کم ——— جب تک وکیل رہا، اس اصول کی سختی سے پابندی کرتا رہا۔"

"آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ وکالت بھی اصول کے تحت کرنی چاہیئے؟" میری آواز میں حیرت و استعجاب کی آمیزش تھی۔

"یہ سب کچھ گھر کی تربیت کے بدولت تھا۔ ہم نے گھر کے ماحول میں کسی کو ضمیر کا سودا کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، ہمیں سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ زندگی کو دولت کا غلام بنا کر نہ رکھنا اور اچھے اصولوں کی خاطر ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار رہنا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ ہم نے جسٹس صاحب سے اجازت لی۔ اجازت دیتے ہوئے فرمانے لگے:

"صحافیوں پر دوہری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ وہ ایک طرف عوام کی خواہشات کے ترجمان ہوتے ہیں اور دوسری طرف ذہنوں کو ارفع مقاصد کے لیے تیار کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کو قوم کی ذہنی اور فکری نشوونما میں فیصلہ کن کردار ادا کرنا چاہیے، خصوصاً اس وقت جب کہ ہمارا ذہین طبقہ فکری انتشار کا شکار ہے۔"

میں نے جسٹس صاحب سے عہد کیا کہ میں اپنی تمام صلاحیتوں کو قوم کی فکری یک جہتی کے لیے استعمال کرتا رہوں گا، کیونکہ میں جو کچھ ہوں، قوم کا ہوں اور اس کے چمن کو شاداب رکھنے کے لیے میں اپنی قوتوں کا آخری قطرہ تک نچوڑ دوں گا۔

جسٹس صاحب کے چہرے پر اُمید کی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

جب ہم کمرے سے باہر نکلے، چاند بھی مسکرا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں نے بھی تمہاری تمام باتیں سُن لی ہیں۔

--

ذوالفقار علی بھٹو

یہ انٹرویو ۱۵، ۱۶ مئی ۶۶ء کو راولپنڈی میں لیا گیا۔

اپریل ۱۹۵۹ء کے غالباً ابتدائی دن تھے، کوئی دس بجے ہوں گے، علم السیاست کے شعبے میں بین الاقوامی قانون کا پیریڈ تھا۔ میں جماعت کے کمرے میں آخری سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اونگھنے کی خواہش مجھ میں اس وقت سے پیدا ہوئی جب میں نے پہلی مرتبہ مغربی پاکستان اسمبلی میں ممبروں کو اگلی سیٹوں پر اونگھتے دیکھا تھا۔ سر کا آہستہ آہستہ نیچے کی طرف ڈھلکنا، گردن کا نصف قوس بنانا اور پھر ایک جھٹکے سے سر کا تن جانا، یہ منظر مجھے اتنا دلکش لگا کہ وزیٹر گیلری ہی میں اونگھنے کو جی چاہا، لیکن یہ سوچ کر رہ گیا کہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ وزیٹر گیلری میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ اونگھ رہے تھے، ایسے میں مجھے اونگھتا ہوا کون دیکھتا؟

ابھی میں اونگھنے کی ابتدائی منزلوں ہی میں تھا کہ ایک نوٹس آیا جس میں لکھا تھا کہ آج سینٹ ہال میں دن کے گیارہ بجے جناب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے دفاعی معاہدوں پر تقریر کریں گے۔ میں نے نوٹس کے الفاظ

سُن کر دل ہی دل میں کہا،

"لیجئے، پھر وہی پُرانا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب وزراء تقریریں زیادہ کرنے لگتے ہیں، تو سمجھ لیجئے کام کی رفتار سست پڑ گئی اور ـــــ ہاں، یہ کیا بوالعجبی ہے کہ بھٹو صاحب وزیر تو ہیں قدرتی وسائل کے اور تقریر کریں گے امورِ خارجہ پر۔ اور یہ تئیس بتیس سال کا نوجوان اس قدر پیچیدہ مسئلے پر کیا بولے گا۔ چھوڑو جی، ان تقریروں وقریروں کو، چپکے سے کھسک چلیں، کسی اچھے سے ہوٹل میں چائے پئیں گے، خوب گپ شپ رہے گی۔ کون دماغ خراب کرے قومی مسائل کو سوچنے میں۔ مملکت کی باتیں خسرواں ہی جانیں۔"

جب مَیں اپنے دل سے باتیں ختم کر چکا، تو مَیں نے ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھا کہ کسی نے میری باتیں نہ سُن لی ہوں، لیکن خدا کا شکر کہ میرا ساتھی بھی اُونگھ رہا تھا۔

مَیں نے کھسک جانے کی کوشش کی، لیکن ہمارے شعبے کے سربراہ، ڈاکٹر فریڈرز، مارشل سٹالن کی طرح تھے۔ انہوں نے اختیارات استعمال کرنے کی دھمکی دی، تو ناچار سینٹ ہال کی طرف جانا پڑا۔ میرے قدم بیگار پر لائے ہوئے مزدور کی طرح اُٹھ رہے تھے۔ سو گز کا فاصلہ بظاہر چند منٹوں میں طے ہو گیا، لیکن ذہن یوں محسوس کر رہا تھا جیسے گھنٹوں چلتا رہا ہوں۔

مَیں ایک کونے میں دبک کے بیٹھ گیا اور اپنے کان اس طرح بند کر لیے کہ شور و شغب کی ذرا سی بھی آواز اندر نہ جانے پائے، مَیں دراصل کئی مہینوں سے ماحول میں رہتے ہوئے، ماحول سے بے خبر رہنے کی مشق کر رہا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد بھٹو صاحب تشریف لے آئے۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ مَیں نے وزیرِ باتدبیر کو وقت پر آتے دیکھا۔ بھٹو صاحب نے آتے ہی مائک سنبھال لیا۔ مَیں ذہن بند کیے آدھا سوتا اور آدھا جاگتا رہا۔

پانچ سات منٹ بعد ہی مَیں نے کچھ یوں محسوس کیا جیسے میرے ذہن کی سطح پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں۔ ہلکی ہلکی سرسراہٹ نے مجھے بے چین کر دیا اور اس بے چینی میں حفاظتی اقدامات درہم برہم ہو گئے اور تقریر کے الفاظ نے ذہن کے اندر داخل ہونا شروع کر دیا۔ مَیں نے شعور کے باڈی گارڈ کو بہت

آوازیں دیں، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ شاید اسے بائی تحت الشعور نے دبوچ لیا تھا۔ انگریزی کے نکھرے اور نکھرے فقرے شبنم کی بوندوں کی طرح ٹپ ٹپ گر کر وائلن کے دھیمے سُر اُٹھا رہے تھے۔

تقریر کے بعد سوالات کرنے کی اجازت دی گئی۔ ہمارے ایک ساتھی نے پُرجوش لہجے میں سوال کیا:

"امریکہ کا رویّہ کشمیر کے بارے میں حوصلہ افزا نہیں، بلکہ اس کی مصلحت آمیز سیاست نے کشمیر کا مسئلہ حل ہونے نہیں دیا۔ جب صورتِ حال یہ ہے، تو سیٹو اور سنٹو کے فوجی معاہدوں میں پاکستان کے شامل رہنے کی کیا تُک ہے، جب کہ ان فوجی معاہدوں نے عرب ممالک، روس اور چین سے ہمارے تعلقات بہت خراب کر دیے ہیں۔"

بھٹو صاحب نے ایک تجربہ کار اُستاد کی طرح جواب دینا شروع کیا۔ اب مجھے وہ جواب تو یاد نہیں، لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ ماحول پر چھا گئے تھے، کم از کم میرا ذہن مطمئن ہو گیا تھا۔ میں ایک اچھا تاثر لے کر اُٹھا اور میں نے اپنے ایک ساتھی سے رازدارانہ لہجے میں کہا:

"یہ صاحب بڑے کام کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مستقبل میں یقیناً کوئی اہم کردار ادا کریں گے۔"

میرے ساتھی نے بُرا سا منہ بنایا اور پھر طنزیہ مُسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا:

"الطاف، تم خواہ مخواہ قیافہ شناس بنتے ہو۔ جسٹس کیانی کے متعلق بھی تم نے یہی کہا تھا، کیا تیر مارا جسٹس کیانی نے؟"

میں اس کی باتیں سُن کر واقعی جھینپ گیا، لیکن پھر اعتماد بحال کرتے ہوئے بولا:

"بھٹو صاحب کی خمدار ناک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس قسم کی ناک والے لوگ بلا کے ذہین اور کچھ کر گزرنے والے ہوتے ہیں۔"

"الطاف، رہنے دو ان بے کار باتوں کو۔ تم اپنی ہی طرف دیکھو، پکوڑا سی ناک ہے، لیکن ہو

غضب کے؛"

بات آئی گئی ہوئی۔

اتفاق سے وہی دوست مجھے ۱۳؍اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ملا۔ وہ انگلستان چلا گیا تھا اور چار سال کے بعد اسی روز لاہور پہنچا تھا۔ اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور میری پیشانی چومتے ہوئے بولا:

"مجھے پتہ نہ تھا کہ تم واقعی بہت زبردست قیافہ شناس ہو، جنگ کے دوران میں بھٹو نے جو کردار ادا کیا، اس سے پورا یورپ اور امریکہ بھونچکا سا رہ گیا ہے۔ مجھے لندن میں کئی ملکوں کے صحافیوں اور سفارتی حلقوں سے ملنے کا موقع ملا، وہ کہتے تھے ہمیں پاکستان کے وزیر خارجہ پر رشک آتا ہے۔ تعجب ہے دُنیا کا سب سے کم عمر وزیر خارجہ اور سفارتی صلاحیتوں کا یہ عالم کہ نیویارک اس کے آگے دم بخود ہے اور اس کا نام سُن کر بھارت کے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ واقعی الطاف، ہم بھٹو پر فخر کر سکتے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے ہزاروں طوفان اس کے سینے میں سمٹے ہوئے ہوں اور اس کے ذہن پر بجلیاں کوند رہی ہوں؛"

ہم دیر تک یہی باتیں کرتے رہے۔ مَیں نے آخر میں کہا:

مصدر پاکستان کی ژرف نگاہی کی داد دیجئے کہ انہوں نے سندھ کے صحرا میں سے ایک پھول کا انتخاب کیا اور اسے گُلِ رعنا بنا دیا؛"

میرا ساتھی ہولے سے مُسکرا دیا، میں دیکھتا ہی رہ گیا یہ ماجرا ہے کیا۔

٭ ٭ ٭

مَیں آج دُنیا کے سب سے کم عمر وزیر خارجہ سے ملنے جا رہا تھا۔

یہ مارچ کی سہانی اور خنک شام تھی۔ تین چار چتکبرے بادل غیر جانب دار ملکوں کے سربراہوں کی طرح ایک جگہ جمع تھے اور آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ذرا فاصلے پر بہت سے بادل آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور دو بادل اس طرح چھپے بیٹھے تھے جیسے بھارت اسرائیل کے ساتھ خفیہ معاہدہ کر رہا ہو۔

ہماری گاڑی فلیٹیز ہوٹل کی طرف رواں دواں تھی۔ بھٹو صاحب ہمیشہ کمرہ نمبر ۵۵ میں ٹھہرتے ہیں۔ میرے ساتھ میرے بڑے بھائی گل حسن صاحب بھی تھے۔ ہمیں صرف بیس منٹ انتظار کرنا پڑا جب ہم اندر داخل ہوئے، تو بھٹو صاحب نے اُٹھ کر استقبال کیا اور محبت بھرے لہجے میں بولے:

"مجھے افسوس ہے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ آپ لوگوں کا وقت تو بہت قیمتی ہوتا ہے۔"

"صحافی انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کی نگاہِ غلط انداز کا اور کبھی ہموار سطح کے نیچے بپھرے ہوئے طوفانوں کا اور ان کا وقت کب قیمتی ہوتا ہے، وہ تو دوسروں کے وقت کو قیمتی بناتے ہیں۔"

بھٹو صاحب زیرِلب مسکرا دیے، اور پھر اُردو ڈائجسٹ میں سے اقبال کے شعر پڑھنے لگے۔ اٹک اٹک کر پڑھ رہے تھے، تاہم یہ محسوس ہوتا تھا کہ شعروں کا مفہوم سمجھ رہے ہیں۔ پھر کہنے لگے:

"فرمائیے، میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"حکم کیسا؟ میں تو سراپا التماس بن کے آیا ہوں۔ آپ سے باتیں کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، کیا مجھ سے باتیں نہیں کریں گے؟"

"ضرور کروں گا۔ میں عوام میں سے ہوں اور ہمیشہ عوام ہی کا رہوں گا۔ مئی کے پہلے ہفتے میں آپ کے لیے ضرور وقت نکالوں گا۔"

میں وعدۂ فردا لے کر چلا آیا۔

جب ہم باہر نکلے، تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ چائے پینے کے لئے دل مچلنے لگا۔ ڈرتے ڈرتے آرڈر دیا، آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد چائے آئی۔ بیرے سے کہا، سینڈوچ تو لے آؤ۔ دس منٹ گزر چکے تو بیرا خراماں خراماں ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے ڈھیر سارے سینڈوچ لا کر میز پر رکھ دیے۔ ہم کثرتِ تعداد سے گھبرا اُٹھے، لیکن یہ سوچ کر خاموش رہے کہ ہم جو کچھ کھائیں گے، اُسی کا بل بنے گا۔ پانچ منٹ بعد بیرا بل لے کر آیا۔ مبلغ اٹھارہ روپے کا بل، بیرے سے عرض کیا کہ ہم نے تو کھایا ہی کچھ نہیں، چائے کی دو پیالیاں پی ہیں اور چار سینڈوچ کھائے ہیں۔ ان کے اٹھارہ روپے تو نہیں بننے چاہئیں، بیرے

نے ایک ادائے بے نیازی سے ہماری طرف دیکھا، کچھ گھورا، پھر لب ہلائے: ہم تو جو سامان لاتے ہیں اس کا بل ساتھ ہی بن جاتا ہے، آپ اس میں سے کچھ کھائیں یا نہ کھائیں۔ صحافی، جس کے ایک ایک پیسے میں اس کا اپنا خون شامل ہوتا ہے، وہ دو پیالیوں کے اٹھارہ روپے کیسے ادا کر سکتا ہے۔ مَیں ہوٹل کے ریسپشن روم میں گیا، وہاں ایک صاحب اُردو نما انگریزی بول رہے تھے، جونہی میں نے حرفِ مدعا اردو میں ادا کیا، وہ صاحب میری اکلوتی شیروانی کو گھورنے لگے۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں اجنبی ملک میں ہوں۔ ابھی آدھی بات ختم ہوئی تھی کہ وہ صاحب جھلّا کر بولے،

"اب کچھ نہیں ہو سکتا، میرے پاس اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں سُننے کے لیے وقت نہیں۔ اگر آپ ایسے ہی غریب ہیں، تو مینجر صاحب سے بات کریں"۔

مَیں نے دل ہی دل میں کہا: "ہائے! یہاں بھی بیورو کریسی موجود ہے"۔

مَیں ڈھیٹ بن کر مینجر صاحب کے پاس گیا، ان سے بات کی، وہ حسنِ اخلاق سے پیش آئے اور بل میں معتدبہ کمی کر دی۔

معلوم ہوا کہ بھٹو صاحب ۱۲ مئی کو ڈھاکہ سے آ رہے ہیں۔ سوچا ایئر پورٹ پر اُن سے ملاقات کی جائے۔ ساڑھے آٹھ بجے ایئر پورٹ پہنچا، تو معلوم ہوا کہ جہاز بیس منٹ لیٹ ہو گیا ہے — بھٹو صاحب آئے، اخباری رپورٹروں نے گھیر لیا، وہ بڑے تحمّل اور احتیاط سے سوالات کے جواب دیتے رہے۔ مَیں خاموشی سے اُن کے سراپا کا جائزہ لیتا رہا، وہ تھکے تھکے سے تھے۔ ان کی متفکر پیشانی اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ اسے مسائل میں ڈوب جانے کی جانے کی عادت ہے۔ چہرے میں ایک حُسن موجود ہے جس میں بچّے کی معصومیت اور مُسکراتی ہوئی نسائیت جذب ہے۔ آنکھوں میں ویرانیاں ہیں۔ وہی ویرانیاں جن پر بستیاں آباد ہوتی ہیں۔ رنگ روپ میں تاج محل کا نکھار ہے، لیکن اس پر انجانی پرچھائیاں عکس ڈالے ہوئے ہیں۔

"خود ہی کہنے لگے: "کل آنا، انٹرویو کے لیے وقت نکال ہی لوں گا"۔

۱۳ مئی کو پھر فلیٹیز پہنچا، پی اے صاحب سے درخواست کی کہ مجھے بھٹو صاحب سے ملنا ہے۔ کہنے لگے "بہت مشکل ہے" میں نے بتایا میں رات بھٹو صاحب کو ائیر پورٹ پر ملا تھا انہوں نے اندر جا کر بتایا، تو مجھے فوراً بلا لیا گیا۔ بھٹو صاحب ہاتھ میں ایک فائل تھامے کھڑے تھے، مجھے دیکھتے ہی دیکھنے لگے،

"قریشی صاحب' آج پھر وعدہ خلافی کر رہا ہوں۔ ایک ایسا اہم کام سر پر آن پڑا ہے جسے آج شام تک ضرور مکمل کرنا ہے آپ پنڈی نہیں آ سکتے؟"

"وہاں تو سر کے بل بھی جایا جا سکتا ہے، میرے ساتھ بدقسمتی یہ ہے کہ سر غائب ہے"

ان کے ہونٹ مسکرائے اور آنکھوں سے ایک انجانا سا مفہوم جھانکنے لگا۔ انہوں نے ڈائری پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا،

"کل شام پانچ بجے میری رہائش گاہ پر آ جائیے۔ آپ کے لیے تو وقت نکالنا ہی پڑے گا، وعدہ جو کر لیا تھا آپ سے۔ جی نہیں چاہتا پہلو بچاؤں"

ہم جب یہ گفتگو کر رہے تھے' اس وقت کمرے میں پی اے صاحب موجود نہ تھے' میں سادگی سے بھٹو صاحب کو سلام کر کے واپس آ گیا۔

۱۴ مئی کو شام کے پونے پانچ بجے ہم بھٹو صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ میرے ساتھ تین رفیق اور تھے۔ کوٹھی کے گیٹ پر "سنتری صاحب" کھڑے تھے۔ میں نے بھٹو صاحب کے بارے میں پوچھا، تو نہایت شائستگی سے جواب دیا کہ وہ پریذیڈنٹ ہاؤس گئے ہوئے ہیں۔ سنتری صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پی اے صاحب بھی موجود نہیں ہیں، البتہ سٹینو گرافر ہیں۔ میں نے پوچھا "کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟" سنتری صاحب نے اس بار بھی خوش خلقی سے صرف اتنا جواب دیا کہ آپ اندر نہیں جا سکتے، تاہم میں آپ کی چٹ انہیں دے آتا ہوں۔ مجھے آپ پر رحم آ گیا ہے، ورنہ چٹ پہنچانے کا کام میرا نہیں۔

"رحم" کا لفظ سُن کر ایک لمحے کے لیے میرا خون کھولنے لگا۔ رحم — یہ تو انفرادیت اور انسانی وقار اور حمیت کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کسی انسان پر رحم کھانے کا۔ رحم — انسان کی سب سے بڑی ذلت ہے اور سب سے بڑی توہین۔ مجھ سے محبت کیجئے اگر آپ کے مرتبے کا نہیں، تو ہمدردی کا اظہار کیجیے۔ مجھ سے نفرت کرنے کا بھی آپ کو پُورا پُورا حق ہے، لیکن خدا کے لیے مجھ پر رحم نہ کھائیے۔

سنتری کے رحم کا زخم کھا کر واپس چلا آیا۔ راستے میں ہمیں وسل کی آواز سنائی دی اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام ٹریفک رُک گئی۔ ہم نے بھی اپنی گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی۔ دو چار منٹ بعد آٹھ دس کاریں زنّاٹے سے آگے گزر گئیں۔ گاڑیوں پر فلیگ تھے اور ان کے اندر خواتین بیٹھی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد ٹریفک کھُل گئی اور ہم ابھی چالیس پچاس گز ہی آگے گئے ہوں گے کہ پھر ٹریفک بند ہوگئی۔ ہاروں سے لدی پھندی گاڑیاں آگے گزر گئیں۔ ۱۵ منٹ کے وقفے میں ہمیں چار بار روکا گیا۔ ڈیڑھ دو سو شیورلیٹ اور بیوک ہماری نظروں کے سامنے سے گزریں۔ یاد آیا آج صدر پاکستان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے طاہر ایوب کی شادی ہے۔ ہم سب بہت خوش ہوئے۔ اگلے دن ہمیں ایک صاحب نے بتایا کہ شادی نہایت سادگی اور وقار سے ہوئی۔ اس خبر سے ہم اور بھی خوش ہوئے۔

مَیں پندرہ پندرہ، بیس بیس منٹ کے بعد بھٹو صاحب کی رہائش گاہ پر فون کرتا رہا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب معلوم ہوا کہ وہ آگئے ہیں۔ ہم اسی وقت روانہ ہوگئے۔ پی اے صاحب کے کمرے میں پہنچا۔ انہوں نے دیکھتے ہی کہا:

"آج تو ملاقات ناممکن ہے۔"

"لیکن بھٹو صاحب نے تو مجھے آج شام کا وقت دیا ہے۔ میں انہیں کے لیے لاہور سے آیا ہوں۔"

"یہ سب ٹھیک ہے، لیکن آج ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

"آپ بھٹو صاحب کو میرے آنے کی اطلاع تو کر دیں۔"

اتنے میں بھٹو صاحب نے فون پر اپنے پی اے کو کسی صاحب سے بات کرانے کے لیے کہا۔ وہ فون کرنے میں مشغول ہو گئے۔ میں ذہن ہی ذہن میں ایسے الفاظ مرتب کرنے کی کوشش کر رہا تھا جن سے پی اے صاحب کی ہمدردی حاصل کر سکوں۔ وہ ذرا فارغ ہوئے، تو میں نے کچھ کہنا ہی چاہا کہ وہ رعب دار آواز میں بولے:

"آپ کل دس بجے فون کر لیجیے، دس بجے صبح"۔

"آپ انہیں اطلاع تو کر دیں"۔

"جی نہیں، میں اطلاع بھی نہیں کر سکتا۔ اچھا شکریہ، خدا حافظ"

چھاتی پر ایک اور داغ لے کے واپس چلا آیا۔ بے بسی کا داغ آسانی سے کب مٹتا ہے؟

اگلے روز صبح پھر حاضری دی۔ پی اے کے کمرے میں داخل ہونے لگا، تو ایک "معصوم صورت" محافظ نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا:

"وہ کہتے ہیں میرے پاس ملنے کے لیے ٹائم نہیں"۔

"لیکن انہوں نے تو خود مجھے دس بجے کا وقت دیا تھا"۔

"ہم کچھ نہیں جانتے، پی اے صاحب کے پاس ٹائم نہیں ہے"۔

"آپ میرا کارڈ تو اندر لے جائیے"۔

اس نے نیم دلی سے میرا کارڈ تھام لیا، وہ اندر گیا اور ایک دو منٹ کی کھسر پھسر کے بعد میرا کارڈ ہاتھ میں لیے باہر آیا۔ پھر وہ اس راہداری میں چلا گیا جس میں بھٹو صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلتا تھا۔ ڈیڑھ دو منٹ بعد وہی کارڈ لیے میرے پاس آ کر رُک گیا۔ کارڈ واپس کرتے ہوئے بولا:

"بڑے صاحب کہتے ہیں میں اس وقت مصروف ہوں، شام کے چار بجے فون کر کے پتہ کر لینا"۔

اس "معصوم صورت" چپڑاسی کی حرکات و سکنات اتنی پُراسرار تھیں کہ مجھے اس کی بات پر یقین تو نہ آیا، لیکن یقین کرنے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا؟ اُسے کیسے کہتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔

اپنے ساتھیوں کے ساتھ، زخم خوردہ شرافت کو تھامے، واپس چلا آیا۔ کچھ تو پنڈی میں گرمی بڑھ رہی تھی اور کچھ میرے دماغ میں خیالات کا الاؤ جل رہا تھا۔ شاید یہ الاؤ میرے دماغ کو پگھلا کر دانشور کے دماغ میں ڈھال دینا چاہتا تھا، لیکن یہ کم بخت پگھل نہ سکا۔ کچھ لمحوں بعد میرے احساس کے متلاطم سمندر میں نیچے ہی نیچے سرد رَویں چلنے لگیں اور میں سوچنے لگا: یہاں خلوص کی قیمت کچھ بھی تو نہیں۔ کسی نے بھی یہ نہ دیکھا کہ مَیں کس جذبے سے یہاں آیا ہوں؟ کسی نے یہ محسوس نہ کیا کہ وہ کون سا اضطراب ہے جو مجھے یہاں بار بار لاتا ہے۔ مَیں کسی ذاتی غرض کے لیے ہاتھ پھیلانے نہیں آیا تھا، میں تو صرف محبت اور دل کی چند باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ مجھے بتا تو دو، کیا یہ کوئی جرم ہے۔

مَیں پھر اس نظام کار پر غور کرنے لگا جس میں وزرائے کرام پی اے کے قید خانے میں رہتے ہیں۔ اس نظام میں اگر پی اے صاحب کسی کو وزیر صاحب سے ملوانا پسند نہ کریں، تو وہ "صاحب" سے کبھی نہ مل سکے گا۔ جمہوری روایات میں ایسا تو نہیں ہوتا۔

مَیں عالمِ کرب میں پہلو بدل بدل کر سوچتا رہا کہ مَیں تو بھٹو صاحب سے وقت لے کر آیا ہوں وہ تو ہیں بھی محبت والے، اس کے باوجود مَیں شیشے کی دیوار عبور نہ کر سکا۔ اگر کہیں مَیں اپنی عوامیت پر اعتماد کر کے ایسے ہی چلا آتا، تو پھر مجھ پر کیا کیا نہ گزرتی۔

چار بجے شام دل شکستہ، ایک بار پھر خلوص کی آزمائش کے لیے پہنچ گیا۔ وہی "فرشتہ صورت" چپراسی نظر آئے۔ مجھے گھورتے ہوئے بولے:

"میں نے تو چار بجے فون کرنے کے لیے کہا تھا، تم چلے کیوں آئے؟"

"آپ کو کیا تکلیف پہنچی ہے؟" مَیں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

وہ میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ایک طرف کو چلا گیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد بھٹو صاحب ایک غیر ملکی کے ساتھ باہر آئے۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا

"تم کب آئے؟" انہوں نے مسکراہٹوں سے خیر مقدم کرتے ہوئے پوچھا۔

"کل آیا تھا۔"

"اچھا، اندر تشریف لے آئیے، کچھ دیر باتیں کرتے ہیں ۔ ابھی ایک اور غیر ملکی سفیر کو آنا ہے، ہم اُس وقت تک تو باتیں کر ہی سکتے ہیں۔"

ہم دونوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے اور بیٹھتے ہی سوال جواب شروع ہو گئے۔

"آپ اپنے خاندان کے پس منظر پر کچھ روشنی ڈالیے۔"

"الطاف، ایک بات سُنو، میں خاندان کے پس منظر کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ میرے خیال میں ہر فرد کی ایک انفرادیت ہوتی ہے، وہی انفرادیت زندگی کے میدان میں کام آتی ہے میں اپنے بچوں پر یہ بات بار بار واضح کر چکا ہوں کہ جہاں انہیں پاکستان کے وزیر خارجہ کی اولاد ہونے کے کچھ فائدے ہیں، وہاں بہت سے نقصانات بھی ہیں۔ سب سے بڑا نقصان یہ کہ وہ زندگی کو پھولوں کی سیج سمجھنے لگیں اور اپنی شخصیت کو اُبھارنے کے لیے وہ جدوجہد نہ کریں جو انہیں کرنی چاہئے۔ میرا نظریہ ہے کہ فرد کو کچھ اپنی جداگانہ روایات قایم کرنی چاہئیں۔"

"اگر کسی کا ایک ایسے خاندان سے تعلق ہے جو اچھی روایات رکھتا ہو تو کیا پھر بھی آپ یہی کہیں گے کہ فرد کو جداگانہ روایات قائم کرنی چاہئیں؟"

"اس صورت میں اسے ان روایات کے ساتھ ساتھ اپنا رول بھی ادا کرنا ہوگا۔"

"آپ کو خاندان سے کس قسم کی روایات ورثے میں ملیں؟"

"آپ جانتے ہیں میرے والد شاہنواز ایک سرگرم سیاسی لیڈر تھے۔ میرے چچا صاحب اسی میدان کے شہسوار تھے۔ یہ دونوں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں سندھ کے نمائندے تھے۔ ۱۹۳۷ء تک سندھ صوبۂ بمبئی کا حصّہ رہا۔ میرے والد اس صوبے کے برسوں وزیر رہے۔ جب سندھ کا علیحدہ صوبہ بنا، تو وہ وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ میری گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ مجھے اکثر اپنے ساتھ دورے پر لے جاتے، مجھ سے اکثر سیاسی نوعیت کی باتیں کرتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مَیں دس گیارہ برس کا تھا، انہوں

نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگے:

"بیٹا، سیاست کی راہ انتہائی کٹھن اور پیچیدہ ہے، لیکن اگر چند اصول اپنا لیے جائیں، تو اس راہ پر چلنے میں لذت ملتی ہے۔ سیاست تو انسانی کردار کی تہذیب کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ بیٹا، میں تمہارے اندر ایک اچھا لیڈر بننے کی تمام صلاحیتیں پاتا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ تم اپنی خداداد صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لاؤ۔ سنو، میں تمہیں سیاست کے تین بڑے اصول بتاتا ہوں: پہلا اصول یہ ہے کہ زندگی میں بہت زیادہ آرزو مند مت بنو۔ بوالہوسی قدم قدم پر فریب دیتی ہے۔ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اپنے کردار میں توازن پیدا کرو۔ کامیابی کے نشے میں لڑکھڑانے نہ لگو اور ناکامی سے اتنے پست ہمت نہ ہو جاؤ کہ سب کچھ چھوڑ بیٹھو۔ زندگی میں یہ دونوں مقام آتے ہیں اور سنبھل سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ عوام پر اعتماد کرو، ان کے جذبات سے باخبر رہو۔ یاد رکھو عوام کے جذبات اور احساسات کے مدِمقابل زیادہ دیر ٹھہرا نہیں جا سکتا۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ اپنے آپ کو خاندانی اور گروہی تعصبات سے بالاتر رکھو۔ اسلام ایک عالمگیر برادری کا علمبردار ہے۔ ایک ایسی برادری جو مساوات کے اصول پر قائم ہوئی ہے۔"

میری سیاست کے یہی تین بڑے ستون ہیں۔"

بھٹو صاحب یہ جملہ ختم کر ہی پائے تھے کہ ملازم اندر داخل ہوا اور غیر ملکی مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی۔ بھٹو صاحب مجھ سے اجازت لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میں ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے میں مجموعی طور پر سرخ رنگ حاوی تھا۔ صوفے سیٹ کی گدّیاں گہرے سرخ کپڑے کی تھیں۔ سامنے اور پہلو میں دو بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں، ان میں بھی سرخ رنگ نمایاں تھا۔ پاکستانی مصنوعات کے چند سادہ ڈیکوریشن پیس رکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کمرے کا مکیں تحفے تحائف سے گریز کرتا ہے، ورنہ یہ سادگی کہاں سے آتی؟ بھٹو صاحب آدھ گھنٹے کے بعد آ گئے۔ میں نے سلسلہ قائم رکھتے ہوئے پوچھا:

"آپ کا خاندان سوسائٹی کے کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے؟"

"سندھ میں ہمارے خاندان کی وسیع زمینیں تھیں۔ زرعی اصلاحات کے بعد ہم لاڑکانہ اور جیکب آباد میں محدود ہو گئے۔"

"پھر تو آپ کی تعلیم انگریزی سکولوں میں ہوئی ہو گی؟"

"بڑی حد تک۔ تعلیم کا آغاز لاڑکانے سے ہوا، پھر بمبئی میں پڑھتا رہا، وہاں سے ۱۹۴۶ء میں امریکہ چلا گیا۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی سے علم السیاست میں بی۔ اے۔ آنرز امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج سے ایم اے علم السیاست کی ڈگری لی۔ دونوں امتحانات کے کورس میں نے ایک ایک سال پہلے ہی مکمل کر لیے۔ اس کے بعد بار ایٹ لا کیا۔ اس دفعہ بھی ایک سال پہلے امتحان دے ڈالا اور شاندار کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۵۳ء میں وطن کی سرزمین پر قدم رکھا اور یوں محسوس کیا جیسے برسوں کی تشنگی بجھ گئی ہے۔"

"کیسی تشنگی؟"

"حقیقت یہ ہے کہ میں سات برس دیارِ غیر میں رہا اور وہاں ہمیشہ وطن کی یاد ستاتی رہی۔ میں اُن اصحاب پر حیران ہوتا ہوں جو پاکستان سے باہر جاتے ہیں، وہ یورپ اور امریکہ کی عشوہ طرازیوں میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ وطن واپس آنے کا نام نہیں لیتے۔ خبر نہیں وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ وطن کا چہرہ سادہ ہی سہی، لیکن اس میں بلا کی کشش ہے۔ میری تو ہمیشہ یہی خواہش رہتی تھی کہ جلد سے جلد وطن پہنچوں اور اپنے عوام کی معاشی اور معاشرتی حالت کو بہتر بنانے کے لیے جدّ وجہد کروں۔ استعماریت نے ہمیں معاشی اور معاشرتی مسائل میں سب سے زیادہ اُلجھایا ہے۔"

"بھٹو صاحب، معاف کیجیے، آپ کو غریب عوام کے مسائل کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ آپ زمینداری کی آغوش میں پلے، اُونچے سکولوں میں تعلیم پاتے رہے اور جب جوان ہوئے، تو امریکہ چلے گئے"

"بہت اچھا سوال اٹھایا آپ نے۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے مجھے تھوڑا سا خاندانی

پس منظر بتانا ہوگا۔ اصل میں میرے والد صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ میری والدہ ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ میں اپنی والدہ کا رہینِ منّت ہوں کہ انہوں نے مجھے غریبوں سے محبت کرنا سکھایا۔ وہ مجھے اکثر غریبوں اور مفلسوں کی تکلیفوں سے آگاہ کرتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ جب میں والد صاحب کے ساتھ دورے پر جاتا، تو غریب کسانوں کی حالتِ زار دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتا۔ پھر بمبئی اور سندھ کے اندرونی حصّے کی معاشی حالت میں غیر معمولی تفاوت تھا۔ اس فرق نے افلاس کے نقوش میرے ذہن پر اور بھی گہرے کر دیئے۔"

"جن دنوں آپ پاکستان سے باہر تھے، آپ کا پاکستان کی دستور سازی کے متعلق کیا تأثر تھا؟"

"میری رائے تھی کہ آغاز غلط ہوا ہے۔ ہمیں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں برسوں ترمیم کرنے کے بجائے فوراً ہی نیا دستور بنا لینا چاہئے تھا۔ ہمیں ماضی سے کٹ کر ایک مکمّل آغاز کرنے کی ضرورت تھی۔ ہماری مثال تو یہ تھی کہ ہمیں پڑوس میں ایک مکان پسند آگیا۔ ہم نے اپنے مکان میں جزوی ترمیم کر کے اسے پڑوسی کے مکان جیسا بنانے کی کوشش کی، نتیجہ ظاہر تھا۔ صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ اپنے مکان کو ڈھا کر اسے نئے سرے سے تعمیر کرتے۔"

"آپ کے خیال میں دستور سازی میں تاخیر کیوں ہو رہی تھی؟"

"حکمران طبقہ انتخابات سے خوف کھاتا تھا، اسے اندیشہ تھا کہ انتخابات میں اس کی قیادت ختم ہو جائے گی۔ اس کی کوشش تھی کہ نئی قیادت اُبھرنے نہ دی جائے اور اس طرح مُدّتِ اقتدار زیادہ سے زیادہ لمبی ہو جائے۔"

"آپ نے ملک میں آنے کے بعد عوام کی حالت بہتر بنانے کے لیے کیا کیا اقدامات کیے؟"

"میں نے لاڑکانہ میں ایک تنظیم بنائی جس کا مقصد کسانوں کے لیے آسائشیں فراہم کرنا تھا۔"

"کیا آپ نے عملی سیاست میں حصّہ لیا؟"

"جی نہیں، ملک میں انتخابات ہی نہیں ہو رہے تھے، عملی سیاست میں حصّہ کیا لیتا۔ ۱۹۵۸ء

میں انتخابات ہونے والے تھے، میں نے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انتخابات ہوتے، تو ملک میں ایک نئی قیادت اُبھرتی؟"

"یقیناً نیا خون آتا اور نئی قیادت اُبھرتی۔ انتخابات ہمیشہ تبدیلیاں لاتے ہیں، انتخابات ہی سیاسی جمود توڑتے ہیں اور سیاسی شعور کی تربیت کرتے ہیں۔ انتخابات کے وقت لوگوں کو یہ دیکھنے کا موقع ملتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ مختلف صلاحیتیں سامنے آتی ہیں، مختلف صلاحیتوں میں انتخاب کا موقع ملتا ہے، عوام دیکھ سکتے ہیں، کہ کس کے معاملات صاف ستھرے ہیں اور کون گندا کھیل کھیل رہا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کا کردار کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ آزاد اور غیر جانبدار انتخابات تو سیاسی زندگی کی رُوح ہیں"

"پاکستان میں آنے کے بعد آپ نے تعلیم کا میدان منتخب کیا یا وکالت کا؟"

"سچ پوچھیے، مجھے علمی مشاغل سے بے حد دلچسپی رہی ہے۔ اسی شوق نے مجھے ساؤتھمپٹن یونیورسٹی (انگلستان) میں کام کرنے پر مجبور کیا۔ میں وہاں بین الاقوامی قانون کا لیکچرار مقرر ہوا۔ مجھے فخر تھا کہ میں ایشیا کا پہلا مسلمان ہوں جسے یہ اعزاز حاصل ہوا، لیکن جلد ہی یہ فخر میرے لیے ایک اُلجھن بن گیا۔ میں سوچنے لگا؛ میری تمام صلاحیتیں میرے ملک کی ہیں، میں یہ صلاحیتیں کسی دوسرے ملک کے لیے کیوں ضائع کروں، چنانچہ اپنے وطن چلا آیا اور سندھ مسلم لا کالج (کراچی) میں بین الاقوامی قانون پڑھانے لگا۔ دوسری طرف وکالت کا کوچہ دعوتِ عزم و شوق دے رہا تھا، میں نے ساتھ ہی ساتھ وکالت بھی شروع کر دی۔ ۱۹۵۶ء میں سکندر مرزا نے اقوام متحدہ کے مندوبین کے لیے میرے نام کی سفارش کی، لیکن میں اس سال نہ جاسکا تاہم ۱۹۵۷ء میں پاکستان کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ میری عمر اُس وقت صرف اُنتیس سال تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کم عمری کے باعث اپنے فرائض خوبی سے ادا نہ کر سکوں گا، لیکن خدا کے فضل سے میری کارکردگی اچھی رہی اور اسی کارکردگی نے مجھ میں وہ اعتماد پیدا کیا جس کی مجھے مستقبل میں سخت ضرورت تھی۔"

ساڑھے پانچ بج رہے تھے، بھٹو صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہنستے ہوئے بولے؛

"بس ختم ہو گیا آپ کا انٹرویو؟"

"جی نہیں، ابھی تک صرف ماضی کی باتیں ہوتی رہیں، اب حال اور مستقبل کی باری ہے اور یہ دونوں ماضی سے زیادہ اہم ہیں۔"

"اب تو میں پریذیڈنٹ ہاؤس جا رہا ہوں، ایک گھنٹے بعد واپس آؤں گا، شاید پھر کچھ وقت نکل آئے۔"

میں جب بھٹو صاحب کے ساتھ باہر نکلا، تو ملازموں اور دوسرے لوگوں نے مجھے سلام کیا اس طرزِ تپاک پر دل جل گیا۔ ہائے یہ جھوٹا احترام!

بھٹو صاحب سوا سات بجے واپس آئے۔ میں باہر ہی کھڑا تھا کہنے لگے:

"مجھے ابھی پھر ایک ضروری کام سے جانا ہے، اس کے بعد لاہور کو روانگی ہے۔ آپ بھی چلیے، ہوائی جہاز میں باتیں ہوں گی۔"

میں بھاگم بھاگ ہوائی اڈے پہنچا۔ سیٹ کے بارے میں معلوم کیا، جواب ملا:

"ہم آپ کو ویٹنگ لسٹ پر رکھے لیتے ہیں، چوتھا نمبر ہے آپ کا، آٹھ بجے پتہ کیجیے۔"

خوش قسمتی سے ایک شناسا مل گئے، انہوں نے پانچ منٹ میں ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں بھٹو صاحب کے پہلو میں بیٹھا تھا، وہ کچھ تھکے تھکے نظر آ رہے تھے، آنکھوں میں ایک اُدھوری داستان پھیلی ہوئی تھی جو مکمّل ہونے کے لیے مضطرب نظر آتی تھی۔ ان کے چہرے کے نقوش آج غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھے۔ ان کی پیشانی آج بھی فکر میں ڈوبی ہوئی تھی جیسے کوئی موڑ آنے والا ہے باتوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔

"بھٹو صاحب، کیا آپ غیر ممالک میں پاکستان کی سفارتی سرگرمیوں سے مطمئن ہیں؟"

ذرا قریب آ کر کہنے لگے:

"ہماری کارکردگی خاصی تسلی بخش ہے۔ دراصل یہ کام وسیع وسائل کا تقاضا کرتا ہے، اور ہم ایک حد سے زیادہ رقم خرچ نہیں کر سکتے۔"

"کیا آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں گے کہ ہماری سفارتی سرگرمیاں معیار سے بہت نیچی ہیں، اور اس کی وجہ پیسوں کی کمی نہیں۔ میرے نوٹس میں انتہائی دلخراش واقعات آئے ہیں۔"

"کیا آپ کے پاس کچھ تجویزیں ہیں؟" بھٹو صاحب نے موضوع میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، پہلی تجویز تو یہ کہ ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہیے جس کا مقصد سفیروں کی تربیت ہو سفارتی معاملات میں یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ ہمارا سفیر جس ملک میں جائے، اسے اس ملک کی زبان آتی ہو۔"

"مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ اگر آپ کا اصول تسلیم کر لیا جائے، تو چین اور روس کا تو کوئی سفیر ہی نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ وہ تو بالترتیب صرف چینی اور روسی زبان بولتے ہیں۔"

"وہ بڑے ملک ہیں اور انہیں بین الاقوامی سیاست میں ایک ایسا مقام حاصل ہے جہاں زبان زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، لیکن پاکستان تو ایک چھوٹا سا ملک ہے۔"

"الطاف، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں اس نقطۂ نظر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ پاکستان ایک چھوٹا سا ملک ہے — پاکستان اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بین الاقوامی سیاست میں مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے۔ پاکستان ہرگز ایک چھوٹا ملک نہیں۔ ہمارا ملک عظیم ہے، ہمارے عوام عظیم ہیں، ہمارے عزائم عظیم ہیں۔"

بھٹو صاحب کا چہرہ متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے ادب سے عرض کیا:

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ پاکستان کو مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے غیر معمولی تیاریوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایسے طریقہ ہائے کار سوچنے چاہییں جن سے زیادہ رقم خرچ کیے بغیر عمدہ نتائج حاصل کر سکیں آپ جانتے ہیں لارنس آف عریبیا نے زبان کے بل بوتے پر انگریزی استعماریت کے لیے کتنا بڑا کام کیا ہمیں تو اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لینا چاہئے۔"

"مجھے اس سے اتفاق ہے، واقعی ہمیں غیر ملکی زبانوں کی تحصیل پر خاص توجہ دینی چاہیے۔ آپ کی دوسری تجویز کیا ہے؟"

"دوسری تجویز یہ ہے کہ ہمیں سیاسی ذہن رکھنے والے ایسے کارکن تیار کرنے چاہییں جو عوام میں کام کرنا جانتے ہوں، پھر ان سیاسی کارکنوں کو مختلف سفارت خانوں میں ایک خاص مدت کے لیے بھیج دینا چاہیے۔ یہ کارکن وہاں کے عوام میں گھل مل جائیں، سیاسی پارٹیوں سے رابطہ قائم کریں، وہاں کے مسائل سمجھیں اور اپنے ملک کے مسائل عمدگی سے پیش کریں۔ میرے خیال میں یہ سیاسی کارکن ملک کے لیے وہ کام کر سکتے ہیں جو سفیروں کے بس میں نہیں۔"

"بہت اچھی تجویز ہے، ہم اس پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔"

"میری تیسری تجویز یہ ہے کہ پاکستان پر مختلف زبانوں میں نہایت خوبصورت لٹریچر تیار ہوتا رہے اور سفارت خانوں کے ذریعے ہر ملک میں پھیلایا جائے۔ پی آئی اے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس کے طیاروں میں پاکستان پر مختلف زبانوں میں بہت دیدہ زیب لٹریچر ہونا چاہیئے۔ ملک میں ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو یہ کام حکومت پر بار ڈالے بغیر کر سکتی ہیں۔ اگر حکومت کو یہ تجویز پسند آئے تو اس کام کے لیے ادارہ اردو ڈائجسٹ اپنی خدمات پیش کر سکتا ہے۔"

"لٹریچر کا تعلق وزارتِ اطلاعات سے ہے، میں ان تک آپ کی تجویز پہنچا دوں گا۔"

طیارہ ہوا کے دوش پر اڑا چلا جا رہا تھا، پرواز انتہائی ہموار اور سرور انگیز تھی۔ ہماری باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میرے اس سوال نے گفتگو کا موضوع بدل دیا:

"اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ اسلامی ممالک نے جنگ کے دوران میں ہماری مدد کی تھی؟"

"یہ ایک حقیقت ہے، وہ ہمارا بہت مضبوط سہارا بنے تھے"

"اسلامی ممالک سے تعلقات اور گہرے کرنے کے لیے آپ کیا کچھ کرنا چاہتے ہیں؟"

"آپ دیکھ رہے ہیں ہم اسلامی ممالک کے مختلف سربراہوں کو پاکستان آنے کی دعوت

دے رہے ہیں۔ معاہدۂ استنبول بھی مثبت رول ادا کر رہا ہے۔"

"ہمیں عوامی سطح پر اس انداز سے ہٹ کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے تعلقات اسلامی ممالک کے عوام سے جتنے زیادہ گہرے ہوں گے، ہمیں اتنا ہی فائدہ ہوگا۔ اس کام کے لیے ہمارے ملک سے ایسے علمأ ایسے اساتذہ اور ایسے صحافی جانے چاہییں جو اسلامی دنیا میں پہلے سے معروف ہوں۔ اسی طرح اُدھر سے علمأ اور فضلأ کو آنا چاہیے۔ وفود کے یہ تبادلے عوام میں محبت اور خیر سگالی کے سچے جذبات اُبھاریں ــــ اور یہی جذبات ذہنی انقلاب لایا کرتے ہیں۔ بھارت، عرب ممالک میں اپنے چوٹی کے علمأ بھیجتا رہتا ہے اور وہ اس طرح ایک بڑی مدت تک اپنا بھرم قائم رکھنے میں کامیاب رہا ہے۔"

"یہ تبادلے یقیناً مفید رہیں گے۔"

"کیا آپ کے خیال میں پاکستان کے اندر ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی ضرورت ہے، جہاں مختلف ممالک، بالخصوص اسلامی ممالک کے مسائل، وہاں کے عسکری اور سیاسی رجحانات، ان کے وسائل اور وہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ماہرین کی رہنمائی میں تحقیقی کام ہوتا رہے یہ تحقیقی کام خارجہ تعلقات کی راہوں کو معیّن کرنے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے؟"

بھٹو صاحب نے دو منٹ کی سوچ بچار کے بعد کہا،

"ایک نہیں، کئی ادارے ہونے چاہییں۔ دراصل یہ کام سیاسی جماعتوں کا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں سیاسی جماعتوں کے بڑے بڑے سیکرٹریٹ ہوتے ہیں جن میں امورِ خارجہ کا بہت بڑا شعبہ ہوتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان سیاسی جماعتوں کی جمع شدہ معلومات اور تجزیہ، حکومت کے تجزیے سے بہتر ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی اس انداز کا کام شروع نہیں ہوا۔ آپ نے ایک اہم مسئلہ قوم کے سامنے رکھ دیا ہے۔ مجھے امید ہے فہمیدہ لوگ اس پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔"

اب ہم انتہائی نازک مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے سادگی سے پوچھ لیا:

"کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بھارت واقعی دل سے پاکستان سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہے؟"

سوال سُن کر بھٹو صاحب نے آنکھیں بند کر لیں، سیٹ پر آگے کی طرف جھکے اور پھر مجھ پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا:

"میرے خیال میں یہ سب فریب ہے، ہماری تو یہ خواہش ہے کہ ہمسایہ ملک کے ساتھ ہمارے تعلقات اچھے ہوں، لیکن بھارت کی نیت ٹھیک نہیں۔ ہندو ذہنیت کی پوری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ ہندو تہذیب کی یہ شروع سے خاصیت رہی ہے کہ اس نے برصغیر میں ہر نئی اُبھرنے والی تہذیب کو اپنے اندر جذب کر لیا اور اس تہذیب کی انقلابی اور تحریکی قوت ختم ہو گئی۔ اس ہندو تہذیب نے بدھ مت کو نگلا، جین مت کی جان نکال لی اور وہ یہی سلوک اسلامی تہذیب سے کرنا چاہتی تھی۔ اسلامی تہذیب اتنی جاندار اور عظیم ہے کہ ہندو تہذیب کے تمام ہتھکنڈے اور حربے ناکام رہے۔ بیسویں صدی میں ہندو تہذیب ایک نیا سوانگ بھر کر سامنے آئی۔ اب اس کا نام انڈین نیشنل کانگریس تھا، منصوبہ یہی تھا کہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کے اندر سے وہ روح کھینچ لی جائے جو اسے زندہ، غیور اور بے باک رکھتی ہے۔ قائداعظم کی کامیابی کا راز صرف اسی بات میں پنہاں تھا کہ ان کی دُور بین نگاہوں نے ہندو ذہنیت کو بے نقاب دیکھا اور پھر ساری کوششیں مسلمانوں میں اس شعور کو اُبھارنے پر صرف کر دیں جو اسے ہندو تہذیب میں مدغم ہونے سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اسی کشمکش میں برصغیر تقسیم ہو گیا۔ ہندو عفریت پیچ و تاب کھاتا رہ گیا اور پھر جلد ہی غمکار پھانسنے کے نئے نئے منصوبے تیار کرنے لگا۔

"ہندو ذہن نے پاکستان کے وجود کو کبھی تسلیم نہیں کیا، تاہم اب اس کی مسلم کُش پالیسی نے ایک نیا رُوپ دھار لیا۔ ہندو قائدین تعاون اور دوستی کی باتیں کرنے لگے۔ ان باتوں سے ان کا مقصد پاکستان کے ذہن میں انتشار پیدا کرنا تھا، وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں ہندو تہذیب کے خلاف جو شدید ردِ عمل پایا جاتا ہے، اس مضبوط قلعے میں تعاون کی آڑ لے کر شگاف کیا جائے۔ ہم نے ان پر یہ بات بار بار واضح کی کہ تعاون صرف دو برابر کے ملکوں کے درمیان ہی ہو سکتا ہے اور جب تم تعاون کی بات کرتے ہو، تو تمہارے پیشِ نظر پاکستان کو ہڑپ کرنا ہے۔

"ہم آج ایک فیصلہ کن موڑ پر کھڑے ہیں۔ بہت ہی جلد ہمیں انتہائی نازک اور انتہائی اہم فیصلہ کرنا ہوگا ــــ ہم بھارت کے فریب کو خوب جانتے ہیں۔ ہم تعاون کے نام پر پاکستان کا وجود خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ اگر بھارت نے ہمیں للکارنے کی ایک بار پھر غلطی کی تو ہم انشاءاللہ حق اور صداقت کی فیصلہ کن جنگ لڑیں گے۔ ہمیں اپنی آزادی عزیز ہے، کشمیر کے پچاس لاکھ انسان عزیز ہیں، ہمیں اپنی عزت اور اپنی تہذیب عزیز ہے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ ان کی حفاظت کے لیے ہمیں ایک بار پھر میدان میں آنا ہوگا۔"

"تقریباً ساری استعماری طاقتیں بھارت کی پشت پناہی کر رہی ہیں، اس حقیقت کے پیش نظر پاکستان کے لیے بہترین راستہ کیا ہے؟"

"الطاف، میں اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ استعماریت آخری دموں پر ہے۔ وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے اور یہی اس کے خاتمے کی دلیل ہے۔ انسانی آزادی اور حریت کا جو طوفان امنڈتا چلا آرہا ہے، اب اس کو روکنا کسی کے بس میں نہیں۔ پاکستان کے لیے سب سے محفوظ راستہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو استعماریت کا شکار نہ ہونے دے اور اپنے وسائل پر بھروسہ کرتے ہوئے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے جدوجہد کرتا چلا جائے۔ ہماری قوم اپنے اندر بے پناہ صلاحیتیں رکھتی ہے، اگر اسے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرنے کا خوگر بنا دیا جائے، تو وہ ایک ناقابلِ تسخیر چٹان بن جائے گی۔"

"قوم میں یہ اعتماد کون پیدا کر سکتا ہے؟"

"ظاہر ہے یہ کام قیادت کے کرنے کا ہے۔"

"کیا ہماری موجودہ قیادت میں اس کام کو سرانجام دینے کی صلاحیت موجود ہے؟"

"اس سوال کا جواب آپ خود ہی تلاش کیجیے۔"

"کیا آپ کے خیال میں قومی مسائل میں اختلاف رائے قومی وحدت کو نقصان پہنچاتا ہے؟"

"جمہوری نظام اختلاف رائے کا احترام کرتا ہے۔ سیاسی زندگی میں اختلاف رائے سے سیاسی شعور پروان چڑھتا ہے، لیکن اگر اختلافِ رائے کے پیچھے دیانت اور بے غرضی کے بجائے مفادات کام کر رہے ہوں، تو یہ ملک کی صحت مند زندگی کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔"

"بھٹو صاحب، اسلامی ممالک کے اتحاد کے سلسلے میں یہ تجویز سامنے آئی ہے کہ مسلم ممالک زیادہ سے زیادہ زرِ مبادلہ کمائیں اور پاکستان ان کے لیے اسلحہ تیار کرے۔ کیا آپ اسے ایک مفید تجویز سمجھتے ہیں؟"

"ہمیں اسلامی ممالک کا اتحاد بہت عزیز ہے، کیونکہ ان کے ساتھ ہمارا تعلق دینی اور روحانی ہے، اور یہ تعلق باقی تمام تعلقات کے مقابلے میں بہت مضبوط اور پائیدار ہے۔ اگر اسلامی ممالک اس تجویز پر متفق ہو جائیں اور ہم مل جُل کر کام کر سکیں، تو اس سے بڑی اور کیا سعادت ہو سکتی ہے۔"

"آپ قوم کے نام کوئی پیغام دینا پسند کریں گے؟"

"قریشی صاحب، پیغام دینے کی ضرورت تو اُس وقت پیش آتی ہے جب ہم ایک دوسرے سے دُور ہوں، محبت اور احترام کے پیغام کسی نامہ و قاصد کے محتاج نہیں ہوتے۔ دلوں کی دھڑکنیں پیغام نشر کرتی رہتی ہیں — تم بہت اصرار کر رہے ہو، اچھا، تو یہ چند الفاظ لے جاؤ: "شوقِ آرزو اور عشق و عزیمت کی چنگاری کو بُجھنے نہ دینا، یہی ہماری قیمتی متاع ہے۔"

یہ پیغام دیتے ہوئے بھٹو صاحب کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ ان کے چہرے پر برٹرینڈ رسل کی عظمتِ فکر کا پَرتو پھیلا ہوا تھا۔

اناؤنسر نے اعلان کیا:

"اب ہم لاہور کے ہوائی اڈے پر اُترنے والے ہیں۔" ہم سنبھل کر بیٹھ گئے اور دو چار منٹ بعد زمین پر اُتر چکے تھے۔ آخری بار میں نے بھٹو صاحب کے چہرے پر نظر ڈالی، ان کی آنکھوں میں سوچ بچار کے ڈورے اور گہرے ہو گئے تھے۔ شاید وہ کوئی اہم فیصلہ کرنے والے تھے۔

خدا حافظ کہتے ہوئے وہ وی آئی پی کی عمارت کی طرف چلے گئے۔

خدا حافظ کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے...

ایئر مارشل اصغر خان

یہ انٹرویو ۱۳، ۱۴، اور ۱۵، مارچ ۱۹۶۸ء کو کراچی میں لیا گیا۔

یہ غالباً اگست ۶۵ء کے پہلے ہفتے کی بات ہے، ایمبسڈر ہوٹل میں پی آئی اے کی طرف سے دوپہر کی دعوت کا انتظام تھا۔ ایئر مارشل اصغر خاں نے حال ہی میں اس تنظیم کی صدارت سنبھالی تھی، وہ پریس سے ملنے آئے تھے۔ ہم نے ایئر مارشل اصغر خاں کا خیر مقدم کیا۔ جچے تلے قدم اُٹھاتے ہوئے وہ ہماری طرف آئے اور اردو کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں ہمارا حال پُوچھا۔ حُسن اتفاق سے مجھے اُن کے بالکل قریب جگہ ملی۔ اُن میں انکسار اور ملنساری کا لطیف امتزاج پایا۔ ہلکی ہلکی مُسکراہٹوں کے دائرے اُن کی معصوم آنکھوں سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔ تقریباً سبھی صحافیوں نے ایئر مارشل کی دلآویز شخصیت سے گہرا اثر قبول کیا، تاہم ایک جہاندیدہ مبصّر نے فرمایا:

"یہ دلآویزی صرف چند ماہ قائم رہے گی۔ پی آئی اے کا مزاج کچھ اور ہے۔ ایئر مارشل نور خاں بھی شروع شروع میں بڑے دھیمے تھے، لیکن بعد میں ان کے ہاں خاصی سختی آ گئی تھی۔"

اس فقرے سے میرے احساسات کو ٹھیس سی لگی۔ میں نے ایئر مارشل اصغر خاں کی طرف دیکھا اور تصوّر ہی تصوّر میں اس بات کا اندازہ لگانا چاہا کہ جب اس چہرے پر سختی آجائے گی، تو یہ کیسا لگے گا۔ پھول کو پتھر میں ڈھالنے کی بڑی کوشش کی اور اپنا ہی پتا پانی پانی ہوگیا۔

دوسری ملاقات ۶، ستمبر ۱۹۶۷ کو ہوئی۔ مَیں اُس روز کراچی میں تھا۔ کارپوریشن نے جانبازوں اور شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے وھاں پان سی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ مَردوں کے مقابلے میں خواتین زیادہ تھیں وہ عظیم افواج کو خراج پیش کرنے سے زیادہ اپنی بہارِ حسن کا خراج وصول کر رہی تھیں۔ اگلی صفوں میں ایئر مارشل اصغر خاں تشریف فرما تھے۔ سچ پُوچھیے مَیں اُنھی سے ملنے آیا تھا۔ تقریب کے اختتام پر اُن کی طرف لپکا اور ڈرتے ڈرتے سلام کیا۔ پہلی ملاقات کو دو برس سے زیادہ ہو چکے تھے اور خیال تھا وہ مجھے پہچانیں گے نہیں، لیکن انہوں نے ٹھہری ٹھہری، مگر خلوص سے مہکی ہوئی آواز میں میرا نام اس محبت سے پکارا کہ ایک لمحے کے لیے میں کانپ اُٹھا۔

"قریشی صاحب، دو برس کے بعد مُلاقات ہو رہی ہے، آپ کبھی آتے ہی نہیں۔"

سر جھکاتے ہوئے جواب دیا،

"بس یہی سوچ کر تکلیف نہیں دی کہ آپ مصروف آدمی ہیں، آپ کا وقت کیوں ضائع کروں؟ پھر اس دَور کی اکثر مُلاقاتیں "کام" کے گرد گھومتی ہیں۔ کوئی "اخلاص زدہ" اگر کام کے بغیر ملنے آئے، تو اس پر بھی کام نکلوانے کی تہمت لگ جاتی ہے۔ ایسے میں ملنے ملانے کا کیا لُطف؟"

وہ ایک معیّن پیمانے پر مُسکراتے رہے۔ لب و لہجے میں وہی پہلی سی نرمی اور شائستگی تھی۔ خیال آیا "انسان" سے ملنا بڑی خوشی کی بات ہے۔ پھُولوں کی مہک اور کلیوں کا گداز "انسان" کے آگے کچھ بھی تو نہیں۔ دراصل جب "انسان" کی اپنی خوشبو اور اپنا رنگ اُڑ جاتا ہے، تو پھر دستِ صبا اور گلِ رعنا کے سہارے ڈھونڈتا ہے اور جب اندر کے تعفّن پر یہ لطافتیں طلوع کرتی ہیں، تو وہ کاغذ کا پھُول بن جاتا ہے اور آج کا انسان اِنہی کاغذ کے پھُولوں میں تُل رہا ہے۔

دس منٹ تک ایئر مارشل سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے آخر میں کہا:

"کیا عرض تمنّا کر سکتا ہوں؟"

"ہاں، ہاں، فرمائیے۔"

"آپ سے انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔"

خاموشی .....

"مَیں نے کچھ عرض کیا تھا۔"

"مَیں اسی پر غور کر رہا ہوں۔ سوچتا ہوں مُدّت ہوئی انٹرویو دیے۔"

پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں مُسکرائے اور قدرے آنکھیں جُھکاتے ہوئے کہا:

"آپ کل فون کر لیجیے۔"

دوسرے روز فون کیا، تو اُن کی سیکرٹری نے ہزاروں سوال کر ڈالے۔ جسے کبھی سادہ سوال کا جواب دینا نہ آیا، وہ بھلا طرحدار سوالوں کا کیا جواب دیتا۔ خاموش رہا اور فقط اتنا کہا "فقیر کا نام آگے پہنچا دیجیے، شاید وہ پہچان لیں۔ سیکرٹری نے بڑی ردوکد کے بعد کہا، اچھا' اور پھر ایک منٹ بعد قدرے بل کھاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا:

"۱۴ ستمبر کو ساڑھے نو بجے تشریف لے آیئے۔"

مختلف وجوہ کی بنا پر میں کراچی نہ جا سکا فروری کے وسط میں ایئر مارشل اصغر خاں سے انٹرویو لینے کا زخمِ شوق ایک بار پھر ہرا ہوا۔ رابطے بڑھے اور ۱۳، مارچ کی تاریخ صبح ملاقات قرار پائی۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے مَیں ایئر مارشل کے کمرے میں تھا۔ وسیع، مگر سادہ سا کمرہ، سامنے دُنیا کا دیوار قد نقشہ آویزاں، روشنی کی سکون بخش لہریں رقصاں اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہَوا کی مست خرامیاں۔ اس سُتھرے ماحول میں جناب اصغر خاں کی بے داغ شخصیت آئینہ بنی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھوں سے دل کی گرمی اور اُن کی آنکھوں سے آبشارِ شرافت پھُوٹ رہی تھی۔ بلند و بالا قامت کو عظمتِ انکسار نے قد آور بنا دیا تھا۔

جسم اور رُوح انسانیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ مستعد اتنے کہ ضمیر کی ہلکی سی آواز بھی سُن لیتے ہیں۔

"آیئے قریشی صاحب' اب کے مُلاقات بہت دیر کے بعد ہوئی!" اُنھوں نے مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا:

"نہیں تو' پچھلے ستمبر ہی میں تو نیاز حاصل ہوئے تھے۔"

"مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے طویل عرصہ گزر گیا۔ آپ اچھے تو ہیں؟"

"جی ہاں' زندگی کو بہلا رہا ہوں۔"

"اشتہارات کے سلسلے میں آپ کو کوئی شکایت تو نہیں؟"

"شکایت تو کبھی کی ہی نہیں' نہ اپنے سے نہ بیگانوں سے۔ جتنا وقت شکوے شکایت میں ضائع ہو' اُسے کسی تعمیری اور مثبت کام میں کیوں نہ لگاؤں۔ ہمارا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ خاموشی سے کام کرتے رہو۔"

"خوب! یہ ایک صحت مند علامت ہے۔" ایئر مارشل نے سنجیدگی سے سوچتے ہوئے کہا۔

"آپ پی آئی اے کے بارے میں کچھ بتایئے۔ عوام کو اس تنظیم سے بہت شکایتیں ہیں۔"

میں یہ کہہ کر رُک گیا اور نظریں ایئر مارشل کے چہرے پر گاڑ دیں۔ انھوں نے بڑے سکون کے ساتھ کہا:

"ہمیں بتایئے وہ شکایتیں کیا ہیں۔ ہم دیانتدار پریس سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ لاگ لپیٹ کے بغیر ہماری خامیوں کا محاسبہ کرتا رہے۔ صحت مند عوامی زندگی کے لیے احتساب بہت ضروری ہے۔"

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو عرض کروں کہ اداروں میں عام رجحان یہی ہے کہ وہ پریس کی نکتہ چینی پسند نہیں کرتے۔"

"یہ رجحان کسی اعتبار سے بھی اچھا نہیں۔ سچی بات سامنے آنی چاہیئے۔ ہماری تنظیم صحت مند تنقید کا ہمیشہ خیر مقدم کرتی ہے۔ ہمارے سرمایے کا ۹۰ فی صد حصہ ٹیکس ادا کرنے والے حضرات فراہم کرتے ہیں۔ انھیں ہم پر کڑی نظر رکھنے کا پُورا پُورا حق ہے۔"

ایئر مارشل صاحب! آپ کے خیالات سُن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کاش! یہ جذبہ عام ہو جائے! اس سلسلے میں ایک بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عوام آپ کے معاملات میں اس لیے زیادہ دلچسپی نہیں لیتے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، انتظامیہ ان کی شکایت پر کان نہیں دھرتی اور اپنے فیصلوں میں رائے عامہ کو شامل نہیں کرتی۔"

میری تنقید کا لہجہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ جناب عمر قریشی، پی آئی اے تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر ہیں، وہ بھی کمرے میں موجود تھے۔ اُن کا چہرہ بار بار پہلو بدل رہا تھا، لیکن ایئر مارشل کے نقش و نگار اور خوشگوار ہو گئے تھے اور وہ میری باتوں میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔

"قریشی صاحب، خبر نہیں عوام کو یہ کیوں احساس ہو گیا ہے کہ ان کی شکایات پر توجہ نہیں دی جاتی۔ ہمارے ہاں طریقِ کار یہ ہے کہ شکایت کرنے والے کو فرداً فرداً جواب دیا جاتا ہے۔ اِس کام کے لیے ایک بڑا عملہ مخصوص ہے۔"

"جناب، اس سلسلے میں میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ مَیں نے تین بار شکایتیں لکھیں، لیکن ایک کا بھی جواب نہ ملا۔ پھر یہی سوچا جب بنتا کچھ نہیں، تو ایئر ہوسٹسوں کی ناراضی کیوں مول لی جائے۔"

"آپ نے براہِ راست مجھے کیوں نہیں لکھا؟"

"آپ کو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔"

"یہ آپ نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ ہمارا کام قوم کی خدمت کرنا ہے۔ منصب جس قدر بڑا ہو، اس کی ذمہ داری بھی اُسی لحاظ سے بڑی اور نازک ہوتی ہے۔ مَیں اپنے آپ کو چھوٹی سے چھوٹی بات کے لیے ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ اچھا، یہ تو بتائیے کہ آپ کی شکایتیں کیا تھیں؟"

"ایک بار مجھے نہایت ضروری کام سے راولپنڈی جانا تھا۔ غالباً وہ دن کے بارہ بجے کی پرواز تھی۔ مَیں نے ساڑھے گیارہ بجے ہوائی اڈے پر فون کیا کہ آیا راولپنڈی ہوائی جہاز وقت پر جا رہا ہے؟ ایک خاتون نے جواب دیا:

"آپ ابھی تک فون ہی کر رہے ہیں، جہاز ٹھیک وقت پر جائے گا، فوراً چلے آئیے۔"

اس روز لاہور میں بھی کام کی بہت زیادتی تھی۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں کچھ سامان لیا، کچھ چھوڑا اور ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہوگیا۔ سوءِ اتفاق سے اُس روز کار بھی قدرے خراب تھی، اس لیے تیز نہ چل سکی۔ خیر ہانپتے کانپتے ہوائی اڈے پہنچے۔ ہوائی اڈے کا ہال خالی پڑا تھا۔ میں یہی سمجھا طیارہ جا چکا، لیکن گھڑی پر ابھی چودہ منٹ باقی تھے۔ ذہنی کشمکش کو ساتھ ساتھ کھینچتا ہوا کاؤنٹر پر پہنچا۔ وہاں بھی ہُو کا عالم تھا۔ ایک صاحب بولے:

"ہوائی جہاز تین گھنٹے لیٹ ہے اور ہم اس کا اعلان تقریباً پون گھنٹہ پہلے کر چکے ہیں۔"

"مگر میں نے پندرہ منٹ پہلے یہاں فون کیا، تو انکوائری نے بتایا کہ جہاز وقت پر جا رہا ہے۔"

"میں انکوائری کا ذمّہ دار نہیں۔"

"مجھے سخت تکلیف پہنچی ہے۔"

"میں اسے خوشی میں تبدیل نہیں کرسکتا۔"

ان کی شیریں گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ کار جا چکی ہے۔ تین گھنٹے ہوائی اڈے پر ضائع نہیں کیے جاسکتے تھے۔ ٹیکسی اور رکشا بھی کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے پی آئی اے کے ایک ذمّہ دار افسر سے درخواست کی کہ مجھے پی آئی اے کی گاڑی پر شہر بھجوا دیا جائے۔ انھوں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا،

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کے چوچلے ہی سہتے رہیں۔"

ایک درویش کی طرح میں اپنا غصہ خود ہی پیتا رہا۔"

جناب اصغر خاں میری اس آپ بیتی سے خاصے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنی وضعدار آواز میں کہا:

"مجھے ذاتی طور پر تکلیف پہنچی ہے۔ اگر آپ اُسی وقت یہ واقعہ مجھے لکھ بھیجتے، تو میں

اس کی پوری تفتیش کرتا۔ اِس کا بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ آئندہ اِس قسم کا رویّہ دُہرایا نہ جاتا۔

اچھا، اب دوسرا واقعہ سُنائیے۔"

"وہ واقعہ ذرا دوسری نوعیت کا ہے۔ مَیں کراچی سے لاہور سفر کر رہا تھا۔ غالبًا رات کے گیارہ بارہ بجے کی پرواز تھی۔ گرمی کا موسم آخری دموں پر تھا۔ ہوائی جہاز میں بیٹھتے ہی مجھے شدید پیاس کا احساس ہوا مَیں نے قریبی ایئر ہوسٹس سے پانی مانگا۔ کہنے لگی: "ذرا ہوائی جہاز کی پرواز ہموار ہو جائے"، مَیں ہموار رفتار کا انتظار کرنے لگا۔ پیاس کی شدّت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ مَیں نے خشک آواز میں ایک اور ایئر ہوسٹس سے التجا کی ۔ "ابھی لاتی ہوں" وہ بجلی کی طرح میرے قریب سے گزر گزر کر میری تشنہ کامی بڑھاتی رہی۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ گزر گیا اور مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے حلق میں کانٹوں کا کھیت اُگ آیا ہے۔ ایک اور ہوسٹس چائے لے کر قریب سے گزری، تو مَیں نے اشاروں سے پانی طلب کیا۔

" دیکھتے نہیں، مَیں مصروف ہوں، لا دیتی ہوں پانی بھی۔"

میں جُوئے آب کے کنارے پانی سے مایوس ہو گیا۔

اب حلق میں آگ سی بھڑکنے لگی۔ جلن اور صرف جلن — میرے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ اسی کیفیت میں گزرا۔ مَیں نے پھر کسی سے پانی نہ مانگا اور نہ کسی کو خیال آیا کہ ایک تشنہ لب پر کیا گزر رہی ہے۔"

ایئر مارشل میری داستان سُنتے رہے اور پھر ذرا رُک کر بولے:

"تیسرا واقعہ بھی تو سُنائیے۔"

"تیسرا واقعہ بہت سادہ ہے، مگر ہے ایک حادثہ۔ لاہور سے پنڈی آیا، سامان کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک شناسا مل گئے۔ میں ان سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔ سامان آگیا اور مسافر اپنا اپنا رختِ سفر اُٹھانے لگے۔ مَیں بھی سامان کی طرف لپکا۔ میرا اٹیچی غائب تھا۔ سامان لانے والوں نے بتایا کہ سارا سامان آچکا ہے۔ باہر نکلنے والے گیٹ کی طرف گیا۔ وہاں سامان کے کارڈ چیک کرنے والا کوئی نہ تھا اور لوگ

چیکنگ کے بغیر سامان اُٹھائے باہر جا رہے تھے۔ میرے اٹیچی میں نہایت اہم کاغذات تھے۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ آدھ گھنٹہ اسی عالم میں گزر گیا۔ ناگاہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب میرا اٹیچی اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میرا اور آپ کا اٹیچی بالکل ایک جیسے تھے۔ اتفاقاً ڈرائیور مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ ایک اٹیچی میں نے لوڈر کو اٹھوایا اور دوسرا اٹیچی غلطی سے ڈرائیور نے اُٹھا لیا۔ میری گاڑی میں دو اٹیچی پہنچ گئے۔ میں نے اس بات کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ گھر پہنچا، تو معلوم ہوا دو اٹیچی آ گئے ہیں۔ اپنا اٹیچی پا کر میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور پی آئی اے کا شکریہ۔

" اِس نوعیت کے واقعات میرے نوٹس میں نہیں آئے۔" ائیر مارشل اصغر خاں نے ذرا اضطراب آمیز لہجے میں کہا۔" قریشی صاحب، سچی بات یہ ہے کہ پوری قوم کا کردار رُوبہ تنزل ہے، پی آئی اے بھی اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ ان خامیوں کے باوجود یہ تنظیم کارکردگی کا ایک اعلیٰ معیار رکھتی ہے۔ ہم پاکستانی ہر معاملے میں بہت اونچا آئیڈیل تراشتے ہیں اور اس اعتبار سے ہماری تنقید کڑی ہوتی ہے۔"

" آپ نے پاک فضائیہ کو کن خطوط پر منظم کیا؟"

" میں اس سوال کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا۔"

" اچھا، تو پھر زندگی کے بارے ہی میں کچھ بتا دیجیے۔"

" قریشی صاحب، میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ ہزاروں انسانوں نے میری زندگی دیکھی ہے۔ یہ کوئی غیر مطبوعہ کتاب نہیں۔ میرے متعلق اُن سے پُوچھیے جن کے درمیان میں رہتا آیا ہوں۔۔۔۔ اور آپ میری زندگی کا کھوج لگا کر کریں گے کیا؟"

" ایک درخواست اور ہے۔"

" فرمائیے۔"

" میں ایک بار اور ملنا چاہتا ہوں۔"

" بڑی خوشی سے۔"

"میں آپ کی اہلیہ محترمہ سے بھی بات کرنا چاہتا ہوں"۔

"ہمارے گھر آج شام ہی آجائیے، میں ان سے کہہ دوں گا کہیں نہ جائیں"۔

گیارہ بجے پہلی ملاقات ختم ہوگئی۔

پورے ساڑھے پانچ بجے میں اپنے بھائی انیس کی معیت میں جناب اصغر خاں کی اقامت گاہ پر پہنچ گیا۔ وہ مجھے ایک وسیع ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ ڈرائنگ روم کی ہر چیز سادگی سے آراستہ تھی اتنے میں مسز اصغر آگئیں، قمیص شلوار میں ملبوس، بہت ہی سادہ۔ ان کی آمد پر اصغر خاں صاحب یہ کہہ کر چلے گئے:

"یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں"۔

"میں نے بے تکلفی سے اپنا مدعا بیان کیا۔ کہنے لگیں:

"میں ان کے بارے میں کیا بتاؤں، بس عام سے انسان ہیں"۔

"آپ نے انہیں بحیثیت شوہر کیسا پایا؟"

"اچھے ہیں، گھر کے معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں، بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے ہیں"۔

"ان کی عادتیں کیسی ہیں؟"

"کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں، اتنا کہہ سکتی ہوں کبھی بلند آواز سے نہیں بولتے، غصہ بہت کم آتا ہے، مزاح کی چاشنی طبیعت میں ہے"۔

"کچھ اور بھی تو بتائیے"۔

"ہاں، یاد آیا، نظم وضبط کے بڑے پابند ہیں، مگر اتنی سختی نہیں کہ بچے خوف کھانے لگیں۔ بس اور کیا بتاؤں"۔

"آپ نے ان کے ساتھ بیس برس گزارے ہیں، کیا آپ بیس منٹ بھی ان کا تذکرہ نہیں کرسکتیں؟

"واقعی سوچتی ہوں میرے پاس کہنے کو کچھ بھی تو نہیں۔ ہاں، ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں۔ میں

ان کی حد درجہ احسان مند ہوں، انہوں نے مجھے کسی مرحلے پر بھی بڑے آدمی کی بیوی ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ گھر میں کچھ اس قسم کی فضا قائم رکھی کہ ہمارے ذہنوں میں کسی طرح کی بُو پیدا ہونے نہیں پائی۔ بچّوں کو آرام اور آسائشوں کا خُوگر نہیں بننے دیا۔ وہ سخت سے سخت ماحول میں بھی مُسکراتے رہیں گے۔ اصغر صاحب سگریٹ نہیں پیتے اور فلم بہت کم دیکھتے ہیں۔ مَیں خود بھی ایک مُدت تک پکچر نہ دیکھ سکی۔ اب بچّے بڑے ہوئے ہیں، تو ان کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ یہ بات حیرت اور خوشی کی ہے کہ ان کے تمام بھائی ایک ہی جیسی طبیعت کے ہیں گویا ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوں۔"

"محترمہ، آپ اصغر خاں صاحب کے خاندان کے بارے میں معلومات دے سکتی ہیں؟"

"جی ہاں، ان کے والد، جواب فوت ہو چکے ہیں، کشمیر فوج میں بریگیڈیر تھے۔ ضابطوں کے سخت پابند اور نہایت بارعب شخصیّت کے مالک تھے، لیکن اس سختی میں بچّوں کے لیے شفقت پوشیدہ تھی۔ صوم وصلوٰۃ کے عادی۔ اصغر کی والدہ حد درجہ سادہ ہیں۔ کہتی ہیں جوانی بھی آرائش و زیبائش سے پاک گزری۔ ان کے والد کو بچّوں کی تربیت کا اس قدر خیال تھا کہ اگرچہ انہیں موسیقی سے بڑا لگاؤ رہا، لیکن اس لیے کہ کہیں بچّوں پر اس کا بُرا اثر نہ پڑے، اس کے نشانات گھریلو زندگی سے بالکل مٹا دیے۔"

اتنے میں ایئر مارشل تشریف لے آئے اور ہمارے ساتھ چائے میں شامل ہوگئے۔ مَیں نے ان سے مُسکراتے ہوئے کہا:

"آپ کی بیگم آپ سے بھی زیادہ کم سُخن نکلیں۔"

"وہ کہیں بھی کیا۔ کہنے کی کوئی بات تو ہو، البتہ کرنے کی بہت سی باتیں ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"مجھے ایک زمانے سے اس کی فکر ہے کہ بچّوں کے لیے خوبصورت، دلچسپ اور آسان اسلامی کتابیں لکھی جائیں۔ میرا خیال ہے بچپنے میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے، اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ مَیں نے جو کتابیں دیکھیں، وہ غیر دلچسپ اور مشکل تھیں۔ بچہ دلچسپ تحریر کی طرف لپکتا ہے۔ مَیں نے

اس سلسلے میں کتابوں کا ایک سیٹ بھی تیار کروایا تھا۔ چاہتا ہوں اس سے بھی بہتر کتابیں عام ہوں"

"ائیرمارشل صاحب، آپ بچوں کو اسلامی تعلیم دلوانا کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟"

"اس لیے کہ اسلامی تعلیمات کے بغیر اچھا کردار تشکیل نہیں پاتا"

"آخر وہ لوگ بھی اپنا کردار تعمیر کرتے ہیں جن کے ہاں اسلامی تعلیمات نافذ نہیں"

"وہ بھی کسی نہ کسی اخلاقی یا ذہنی نظام کا سہارا لیتے ہیں"

"ہم بھی انہی کا سہارا کیوں نہ لیں؟"

"یہ تو ہماری نادانی ہوگی کہ ایک طاقت ور نظام کے ہوتے ہوئے ہم کمزور باتوں کا سہارا لیں۔ اسلام کے حقیقی نظامِ اقدار کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔ پاکستان میں ہمارے پاس پہلے سے ایک مضبوط بنیاد موجود ہے۔ ہم اسے تباہ کر کے نئی بنیاد کبھی تعمیر نہ کر سکیں گے اور آخر ہم ایسا کریں کیوں؟ اپنی قوتوں کو منفی راہوں میں ضائع کرنے کے بجائے انہیں مثبت طریقوں سے کردار کی تعمیر میں لگائیں"

"کیا آپ نے پاک ائیرفورس کے جوانوں میں اسلامی علوم کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی؟"

"جی ہاں، میں چاہتا تھا کہ اسلامی علوم کے لیے ایسے اساتذہ لیے جائیں جن کی ذہنی سطح بلند ہو، جدید علوم سے بھی باخبر ہوں اور ان کی معاشرتی حیثیت اچھی ہو تاکہ نوجوان ان کی باتوں کو پوری اہمیت دیں۔ جدید علوم سے آراستہ نوجوانوں کو پڑھانے کے لیے اگر نسبتاً کم علم مولوی مقرر کر دیا جائے، تو وہ اس کو اور اس کی باتوں کو کچھ بھی وزن نہ دیں گے۔ بار بار کی کوشش کے باوجود میں اس معیار کے عالم حاصل نہ کر سکا۔ مجھے یقین ہے اسلامی اندازِ نظر سے زندگی میں بڑا توازن اور اعتدال آجاتا ہے اور ایسا کردار تعمیر ہوتا ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہو"

"ہمیں ستمبر کی جنگ میں جو عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی، کیا اس میں جذبۂ ایمانی کا بھی کوئی دخل ہے؟"

"یقیناً جذبۂ ایمانی کا بڑا دخل ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی ہمارے ساتھ رہی، لیکن یہ سب کچھ

اُسی وقت ہوتا ہے جب ہم اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔"

اتنے میں ان کا ایک بچّہ ادھر سے گزرا، عُمر یہی کوئی دس برس کی ہوگی۔ سادہ سے کپڑے چہرے پر انکسار، چال ڈھال میں بلا کی تیزی، مگر سنبھلی ہوئی۔ وہ ہمیں سلام کر کے دوسری طرف چلا گیا۔

"ہمیں اِس عُمر کے بچّے کے لیے اچھی اسلامی کتابیں چاہئیں۔" ایئر مارشل نے کہا۔ 17.9.ص ج

"مَیں بھی اُردُو کی کتابیں پڑھنا چاہتی ہوں، لیکن میری اُردو اچھی نہیں۔ کانونٹ سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اُردو زبان نہ آئی۔" مسز اصغر نے بڑے بھولپن سے کہا۔

"میں نے اسی لیے اپنے بچّوں کو کانونٹ سکولوں میں نہیں بھیجا۔ مجھے یہ سکول ذرا اچھے نہیں لگتے، قومی جذبہ اور شعور تو پیدا ہی نہیں ہونے دیتے۔" جناب اصغر خاں نے اپنی مخصوص ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔)

مغرب کی نماز کا وقت قریب آ رہا تھا، ہم نے اجازت لی۔ چلتے وقت مارچ کا اُردو ڈائجسٹ مسز اصغر کو دیا کہ ذرا اسے پڑھ کر تو دیکھیے، شاید یہ آپ کی اُردو کو آپ کی سیرت کی طرح دلکش بنا دے۔

دوسری ملاقات بھی ختم ہو گئی۔

اگلے دن پی آئی اے کے مختلف شعبے دیکھتا رہا، ان کی تفصیلات پھر کبھی لکھوں گا۔ ساتھ ہی ساتھ اُن آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی جنہوں نے ایئر مارشل کی زندگی کے نقش و نگار دیکھے ہیں دفتر میں سرِ راہ ایئر مارشل سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئے اور کہنے لگے۔

"آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"یہ میری خوش نصیبی ہے۔"

"میں نے رات آپ کا مضمون پڑھا، وہی اگرتلہ سازش والا۔ بہت پسند آیا۔ آپ اس کا بنگلہ میں ترجمہ کیوں نہیں کراتے؟ میرے خیال میں آپ بنگلہ میں بھی ایک ڈائجسٹ نکالیں۔ افکار اور خیالات

کو دونوں بازوؤں میں سفر کرنا چاہیے۔ دونوں بازوؤں کا حقیقی معنوں میں اتحاد پاکستان کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ علیحدگی پسندی کے رجحانات کسی کے لیے بھی سُود مند نہیں۔ مغربی پاکستان کے بغیر مشرقی پاکستان ایک دن بھی آزادی کا سانس نہیں لے سکتا اور اسی طرح مشرقی پاکستان کے بغیر مغربی پاکستان آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اتحاد و یگانگت پیدا کرنے میں اچھے رسائل اور کتابیں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ میرے نزدیک جغرافیائی فاصلے اب کوئی اہمیت نہیں رکھتے، بس ذہنی فاصلے نہیں ہونے چاہئیں"

سیکرٹری صاحب نے آکر ہمارا سلسلۂ کلام منقطع کر دیا۔ وہ اب بھی کسی اپائنٹمنٹ کا مژدہ لے کر آئی تھیں۔ میں نے زیادہ بیٹھنا مناسب نہ سمجھا، تاہم وہی درخواست پھر دُہرائی کہ آپ سے ایک بار اور ملنا چاہتا ہوں (انکار کرنا تو وہ جانتے ہی نہیں، بھلا مجھ جیسے درویش سے کیا انکار کرتے) کہنے لگے:

"جلد ہی آپ کو وقت سے مطلع کروں گا۔"

میں مختلف راہوں پر ایئر مارشل کی زندگی کا سراغ لگاتا رہا۔

بارہ بجے کے قریب پیغام ملا کہ ملاقات کا وقت سوا دو بجے مقرر ہوا ہے۔

وہ ایک وضعدار انسان کی طرح میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ کمرے میں ہمارے سوا اور کوئی نہ تھا۔

"مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے، اسی لیے بار بار ملنے آتا ہوں" یہ فقرہ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔

("محبت تو اچھی چیز ہے اگر سچی ہو" وہ آنکھوں سے مُسکرائے)

"جناب، قوم کے نام کوئی پیغام ہی دے دیجئے"

("پیغام دینے والوں کی پہلے ہی کب کمی ہے اور میں کس قابل ہوں")

"آپ نے سخت محنت اور ریاضت کی زندگی گزاری ہے، کچھ ہمیں بھی تو بتائیے ریاضت کی عادت کیونکر پڑتی ہے؟"

"میری رائے میں ہماری قوم حد درجہ محنتی اور جذبے والی ہے۔ باہر جاکر معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم میں کیا کیا جوہر ہیں"۔

"جناب، اگر ہماری قوم میں محنت کی صفات پائی جاتی ہیں، تو معاشرے میں صحت مند زندگی پنپ کیوں نہیں رہی"؟

اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ مختلف سطحوں پر بے لوث اور بے غرض قیادت مفقود ہے۔ قوم میں بے پناہ جذبہ اور ولولہ ہے، لیکن اسے صحیح خطوط پر تربیت دینے والے ہاتھ نظر نہیں آتے۔ میری آنکھوں نے تین موقعوں پر قوم کا عدیم المثال جوش وخروش دیکھا، لیکن ہم اسے مستقل حیثیت نہ دے سکے"۔

مَیں ذہن ہی ذہن میں تین موقعوں کو تلاش کرتا رہا۔ ایک وہ موقع جب پاکستان بنا تھا۔ شاید دوسرا وہ موقع جب مارشل لاء نافذ ہوا۔ تیسرا وہ موقع جب ہم نے بھارت کے خلاف اپنی آزادی اور بقا کی جنگ لڑی۔ واقعی ان تینوں موقعوں پر قوم نے عظیم الشان زندگی کا ثبوت دیا تھا، مگر روش زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ شاید اس لیے کہ ہنگامی روّیے غباروں کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔ میں نے اپنا یہ احساس ایئرمارشل صاحب کی طرف منتقل کرتے ہوئے کہا:

"وقتی جذبوں سے کیا کوئی تعمیری کام لیا جاسکتا ہے"؟

"کیوں نہیں، غالباً مسلمان قوم کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ سخت حالات میں اپنی صلاحیتوں سے کام لیتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء کو ہم قائداعظمؒ سے ملے تھے میں تو اُس وقت ایک جونیئر افسر تھا، اس لیے پیچھے کھڑا رہا، البتہ جنرل اکبر خاں پیش پیش تھے۔

دورانِ گفتگو میں قائداعظم نے ایک مرحلے پر فرمایا:

"مسلمانوں کی پوری تاریخ دیکھ لیجیے، ان پر جب کبھی بُرا وقت آیا، اُسی وقت ان کے اندر سے عمل اور کردار کی بے پناہ قوتیں اُمڈ پڑیں۔ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ انشاء اللہ ہماری قوم ایک عظیم تاریخ بنائے گی"۔

میرے کانوں میں قائدِ اعظمؒ کے یہ الفاظ آج بھی گونج رہے ہیں اور میں پُر اُمید ہوں کہ ہمارا حال اور ہمارا مستقبل درخشندہ رہے گا۔ پھر انہوں نے میری طرف خاص نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"ہم مستقل طور پر بیرونی خطروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ بھارت نے پاکستان کو قبول نہیں کیا ہے۔ پاکستان بننے سے ایک دو روز پہلے ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس سے مجھے صورتِ حال کی نزاکت کا شروع ہی سے شدید احساس ہو گیا تھا — غالباً یہ گیارہ بارہ اگست کی بات ہے۔ برِصغیر آزاد ہونے والا تھا اور پریڈ کے سلسلے میں ہم بھارت کے جنرل تھمیا کے ساتھ کھڑے تھے۔ زیادہ تر غیر مسلم فوجی حکّام تھے۔ اتنے میں ہند پارلیمنٹ کا ایک ہندو ممبر جنرل تھمیا کے پاس آیا اور اس نے یہ سمجھا کہ یہاں تمام کے تمام غیر مسلم حکّام کھڑے ہیں۔ اُس نے جنرل کا دامن پکڑتے ہوئے پُوچھا:

"مجھے یہ بتاؤ ہم پاکستان کو کتنے گھنٹے میں فتح کر لیں گے"۔

"جنرل میری موجودگی کی وجہ سے اُسے ٹالتا رہا، لیکن اس شخص نے پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ بار بار یہی پوچھتا تھا کہ آپ پاکستان پر کب حملہ کر رہے ہیں۔

"اُس منظر نے میرے دل پر گہرا اثر کیا اور مجھے یہ یقین ہو گیا کہ پاکستان کو زندہ رہنے کے لیے ہر وقت چاق چوبند رہنا پڑے گا۔ میں نے پاک فضائیہ کی تربیت اسی اصول پر کی تھی کہ بس اَب حملہ ہوا اور اب ہوا۔ ہماری اسی تیاری نے ستمبر میں دشمن کے ناپاک ارادوں کو ناکام بنایا۔ ہمارے پاس مادّی اسباب کم ہیں، اور وہ مسلمانوں کے پاس ہمیشہ کم رہے ہیں، لیکن اسلحہ سے زیادہ اہم انسان کا فولادی جذبہ اور اس کی ناقابلِ تسخیر رُوح ہے۔ مجھے یقین ہے دُشمن ہمیں ہر وقت تیار اور مستعد پائے گا"۔

انہوں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا:

"قریشی صاحب، مجھے افسوس ہے میں آپ سے زیادہ باتیں نہ کر سکا۔ میں سمجھتا ہوں ہمیں اچھی باتیں بھی کرنی چاہییں، لیکن زیادہ ضروری اچھی مثالیں قائم کرنا ہے۔ آپ دعا کیجیے یہ زندگی کوئی اچھی مثال بن سکے"۔

آخری ملاقات بھی عہدِ جوانی کی طرح مختصر تھی۔

میں ایئر مارشل کی زندگی کے صرف چند موڑ جمع کر سکا۔

ایئر مارشل اصغر خاں کا تعلق آفریدی قبیلے سے ہے۔ ان کے والد بریگیڈیئر رحمت اللہ زیادہ عرصہ کشمیر میں رہے۔ اصغر خاں صاحب کے آٹھ بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ آٹھ میں سے دو بھائیوں نے پاک فضائیہ پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ دونوں ہوائی حادثے کا شکار ہوئے۔

(جناب اصغر خاں ۱۷ جنوری ۱۹۲۱ کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے پرنس ویلز ملٹری کالج ڈیرہ دُون میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور انڈین ملٹری اکیڈمی سے ۱۹۴۰ء میں گریجویٹ ہوئے کمیشن انہیں آرمی میں ملا، لیکن ایک ہی سال بعد انڈین ایئر فورس میں چلے گئے۔)

دوسری جنگِ عظیم میں وہ اراکان فائٹر سکوڈرن میں رہے۔ پھر چیف انسٹرکٹر کی حیثیت سے انبالہ آئے اور پائلٹوں کو تربیت دیتے رہے۔ اس تجربے سے پاکستان کو بہت فائدہ پہنچا۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد وہ پاکستان ایئر فورس کالج (رسالپور) کے پہلے کمانڈنٹ بنائے گئے۔ ۱۹۴۹ میں گروپ کمانڈر کا منصب ملا۔ مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے جولائی ۱۹۵۷ میں پاک فضائیہ کے پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ آپ دنیا کے سب سے کم عمر کمانڈر انچیف تھے۔ سیٹو کے عسکری معاملات میں فوجی مشیر کی حیثیت سے پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ جولائی ۱۹۶۵ تک آپ نے یہ ذمّہ داریاں سنبھالیں۔ پاک فضائیہ سے ریٹائر ہوتے ہی وہ پی۔ آئی۔ اے کے صدر اور سیر و سیاحت اور شہری ہوابازی کے سربراہ مقرر ہوئے۔

پاک ایئر فورس میں آپ نے ہر قسم کا ہوائی جہاز خود اُڑایا ہے اور اب اُن کے پاس بوئنگ ہوائی جہاز کی پرواز کا لائسنس ہے۔ پوری دُنیا میں وہ واحد شخص ہیں جو ہوائی کمپنی کے سربراہ ہوتے ہوئے پرواز کا لائسنس رکھتے ہیں۔

وہ امپیریل ڈیفنس کالج لندن، دی فائٹر لیڈرز سکول، ایئر سٹاف کالج اور جائنٹ سروسز سٹاف

کالج کے گریجویٹ بھی ہیں۔

ایئر مارشل کی شخصیّت کے بھُول آنکھوں سے پھُٹنے۔ اس کے لیے پشاور سے لے کر کراچی تک بہت سے اصحاب سے ملا، اِن میں ان کے مدح سرا بھی شامل تھے اور ان کے نکتہ چیں بھی۔ ایک صاحب نے ملتے ہی کہا:

"اگر ہمارے پاس اصغر خاں جیسے پانچ افراد اور ہوں، تو قومی زندگی میں انقلاب آجائے۔"

میں نے شروع میں اسے ایک جذباتی دھماکے سے زیادہ اہمیت نہ دی، لیکن بعد میں میرے جذبات بھی دامنِ خرد کو کھینچتے تھے۔

اِس حقیقت کا مخالفین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ایئر مارشل اصغر خاں بلا کی نظر رکھتے ہیں اور ان کا دماغ حیرت انگیز طور پر کام کرتا ہے۔ ایک صاحب نے بڑا دلچسپ واقعہ سُنایا:

"ایئر مارشل نے ڈیفنس سوسائٹی کراچی میں اپنا ایک مکان بنوایا۔ مکان کی ڈیزائننگ بہت مشہور آرکی ٹیکٹ مسٹر بلوم فیلڈ نے کی تھی۔ ایک روز ایئر مارشل اسی فرم کے ایک کہنہ مشق انجنیئر مسٹر للّن کے ساتھ مکان دیکھنے گئے۔ ایئر مارشل سیڑھیوں سے اُوپر چلے گئے اور واپس اُترتے ہوئے ایک سیڑھی پر آکر رُکے۔

"مسٹر للّن، یہ سیڑھی چھوٹی ہے۔"

"جی نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"میرے خیال میں یہ ½ انچ چھوٹی ہے۔"

مسٹر للّن اختلاف کرتے رہے۔ فیتہ منگوایا گیا اور سیڑھی واقعی ٹھیک ½ انچ چھوٹی تھی۔ سب حیران رہ گئے۔

ایک صاحب نے بتایا ایک موقع پر ایئر مارشل کو ہماری پریڈ کا معائنہ کرنا تھا۔ کمانڈر انچیف کے معائنے سے پہلے کئی اور ذمہ دار افسر پریڈ کا معائنہ کر چکے تھے۔ ایئر مارشل آئے، پریڈ پر سرسری نظر ڈالی اور ایک جگہ آکر رُک گئے۔

"چار فیتے نظر آ رہے ہیں"۔

ہوتا یہ ہے کہ بُوٹ پر پٹی اس طرح باندھی جاتی ہے کہ اس کے تین فیتے نظر آنے چاہئیں۔ فاصلے سے اتنے باریک فرق کو صرف ایئر مارشل کی نظر ہی دیکھ سکتی تھی۔

ایئر مارشل کے ساتھیوں نے ان کے حافظے کے بے شمار دلچسپ واقعات سُنائے۔ اختصار کے طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ جس شخص کو ایک بار دیکھ لیا، بیس برس کے بعد بھی بڑی آسانی سے پہچان لیں گے۔ وہ اکثر رفیقوں اور کارکنوں کو نام سے پکارتے ہیں۔

فوجی صلاحیتوں کے بارے میں جب مَیں نے مختلف احباب سے سوال کیا، تو ان سب کا ایک ہی جواب تھا:

"ستمبر کی جنگ میں پاک فضائیہ کی برتری ایئر مارشل کی فوجی صلاحیتوں کا جیتا جاگتا کرشمہ ہے۔ انہوں نے اس جنگ میں جو کردار پیش کیا ہے، اربابِ بصیرت اچھی طرح واقف ہیں۔ پہلے رسالپور میں ایک تربیتی کالج کی بنیاد رکھی، ہوابازوں کو تربیت دی اور پھر انہیں فضا میں اس طرح تیار کیا کہ ان کی پھُرتی، شجاعت اور حیرت انگیز کارکردگی پر پوری دُنیا حیرت زدہ رہ گئی"۔

ایک قریبی دوست نے بتایا:

"ایئر مارشل نوجوانوں میں جذبہ اور اعتماد پھُونکنے میں کیونکر کامیاب ہوئے، یہ ایک بڑی دلچسپ داستان ہے۔ ان کا اصول یہ تھا کہ مشکل کام کا حکم دینے سے پہلے اُسے خود کر کے دکھاتے۔ سخت سے سخت مشقوں کا آغاز اپنی ذات سے کرتے۔ خطرناک مہموں پر سب سے پہلے خود جاتے۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے کسی بھی ہواباز میں کبھی بے یقینی کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔

"ایئر مارشل کا دوسرا اصول یہ تھا کہ ہوابازوں کو پُورا پورا آرام ملے۔ جسمانی آرام کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی سکون کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ اگر ایک ہواباز کی گھریلو زندگی پریشان سی ہو، تو وہ فضا میں خوفناک حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایئر مارشل نے سائنسی بنیادوں پر

کام کیا۔ طب اور نفسیات کے ماہرین سے ایک رپورٹ مرتب کروائی جس میں ہوابازکے ذہنی خلفشار کے مہلک نتائج کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کی روشنی میں انھوں نے خواتین کی ایک ٹیم تیار کی جو ہوابازوں کی بیگمات کو یہ بتاتی تھی کہ تمہاری ذراسی جھک جھک سے تمہارے خاوند کی زندگی کس طرح خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ان کوششوں کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

ان کا تیسرا اصول یہ تھا کہ پاک فضائیہ کو دفاعی جنگ کے لیے تیار کیا جائے۔ ان کا اندازہ تھا کہ جنگ جب کبھی ہوگی، بہت شدید اور بہت تیز ہوگی اور اس جنگ کا فیصلہ شروع کے دو تین روز ہی میں ہو جائے گا۔ اپنے اس اندازے کے مطابق انھوں نے تربیت — ہمہ وقت تربیت اور مکمل تربیت پر زور دیا۔ ان کی تربیت سے ہماری فضائیہ اس انجام سے بچ گئی جو شرقِ اوسط میں عرب فضائیہ کا ہوا اور ہماری مختصر سی فضائیہ نے ایک بہت بڑے دشمن کو ٹھنڈا کر دیا۔"

ایئر مارشل کے کردار کے متعلق ایک جواں سال افسر نے خوب بات کہی،

("وہ با اصول، باضمیر، صابر اور بُردبار سبھی کچھ ہیں، مگر مجھے ان کی یہ ادا سب سے زیادہ پسند ہے کہ انھیں اپنے جسم اور اپنی رُوح پر پُورا پُورا اختیار رہے۔ ان کا منضبط ذہن اور ان کا منضبط کردار اخلاقی قدروں سے غذا حاصل کرتا ہے۔")

ایک دوسرے صاحب نے بتایا وہ ہر کام قاعدے کے مطابق کرتے ہیں، خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگے اور کتنا ہی ایثار کرنا پڑے۔ وہ جب پی آئی اے میں آئے اور انھوں نے پرواز کے لیے لائسنس لینا چاہا، تو وہ اُن تمام ضابطوں سے گزرے جن ضابطوں سے ایک عام ہواباز گزرتا ہے، بلکہ اپنے اوپر اور زیادہ پابندیاں عائد کر دیں۔ ایک عام ہواباز کو پاکستان ہی میں امتحان دے کر لائسنس مل جاتا ہے۔ انھوں نے کہا آپ لوگ مجھے ایسے ہی پاس کر دیں گے، چنانچہ امریکہ کی بین الاقوامی تنظیم کے سامنے امتحان دیا اور وہاں سے لائسنس حاصل کیا۔

("سفارش انھیں سخت ناپسند ہے۔ ان کی نظر ہر وقت آدمی کے کردار، اس کی کارکردگی پر

رہتی ہے۔ بڑے بڑے نازک موقع آئے، لیکن انہوں نے سفارش کے آگے سر نہ جھکایا۔ قیافہ شناس ایسے کہ ایک نظر ڈالتے ہی انسان کی خوبیوں اور خرابیوں کو بھانپ لیتے ہیں۔ اگر کسی میں خرابی ہو، اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر وہ صاحب اصلاح قبول کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہیں، تو پھر معاف نہیں کرتے، خواہ وہ قریبی رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں۔"

دولت اور مناصب سے انہیں ذرا محبت نہیں، بلکہ ان سے دور بھاگتے ہیں۔ جب وہ پاکستان ائیر فورس سے ریٹائر ہونے لگے، تو اُن کے ایک رشتے دار نے کہا:

"آپ پاک فضائیہ میں ابھی اور قیام کریں، قوم کو آپ کی صلاحیتوں کی سخت ضرورت ہے۔"

"میں نے کمان تیار کر دی ہے، میں اس پر مسلط نہیں رہنا چاہتا۔ یہ بات کسی تنظیم کے لیے بھی اچھی نہیں کہ وہ ایک شخص کے گرد گھومتی رہے۔"

اَب وہ پی آئی اے سے بھی جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں: "نوجوانوں کو کام کرنے کا موقع ملنا چاہیئے آخر ہم مناصب سے کیوں چمٹے رہیں۔"

ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنا بدل ضرور تیار کرتے ہیں۔ کسی جگہ خلا چھوڑ کر نہیں جاتے۔ شاید وہ اپنے رفیقوں پر بہت اعتماد کرتے ہیں اور اپنی موجودگی میں انہیں ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل بنا جاتے ہیں۔

پبلک لائف کے وقار کا انہیں حد درجہ خیال رہتا ہے۔ خود تو انہوں نے دولت کو کبھی اپنا معبود نہیں بنایا اور نہ اپنے دامن کو رنگِ ہوس سے داغدار ہونے دیا، مگر وہ اس بات کی بھی بہت احتیاط کرتے ہیں کہ ان کے منصب سے ان کے رشتہ دار اور دوست احباب ناجائز فائدہ نہ اُٹھالیں؛ وہ تو جائز فائدہ بھی نہیں اُٹھانے دیتے۔ دراصل وہ اعلیٰ پائے کی صحت مند روایات قائم کرنا چاہتے ہیں ایک واقعے سے ان کی روحِ تقویٰ کا اندازہ لگائیے:

"ائیر مارشل کے بھائی بریگیڈیر افضل خاں کا ایک ڈیری فارم ہے، وہ عرصے سے پی آئی اے

کو کچھ چیزیں مہیا کیا کرتے تھے۔ جب ائیر مارشل نے پی آئی اے کا چارج سنبھالا، تو پہلا کام یہ کیا کہ اپنے دستخطوں سے اپنے بھائی کو خط لکھا کہ آج کے بعد سے آپ کی فرم کا پی آئی اے اور شہری ہوابازی کے محکمے سے کوئی کاروباری لین دین نہیں ہونا چاہیئے۔ اس خط سے کرنل افضل خاں کو خاصی بڑی رقم کا نقصان پہنچا ہے، مگر ائیر مارشل نے ایک اچھی مثال قائم کرنے کے لیے ہنسی خوشی یہ قربانی دے دی")

راست گو اتنے کہ حق بات کہتے ہوئے کسی سے خوف محسوس نہیں کرتے۔ اس سے بڑی بات یہ کہ سچ سُننے کا بھی پُورا پُورا حوصلہ رکھتے ہیں۔

ماتحتوں سے عمدہ سلوک کرتے ہیں۔ ایک بار سربراہِ مملکت آ رہے تھے۔ ائیر مارشل کو ان کی آمد کا وقت غلط بتایا گیا جس کی وجہ سے وہ وقت پر نہ پہنچ سکے۔ جن صاحب سے غلطی ہوئی تھی انہوں نے کہا میری ذہنی حالت کچھ ایسی تھی کہ مجھ سے غلطی ہو گئی — ائیر مارشل نے کہا،

"اچھا کوئی بات نہیں"

سوچتا ہوں قوم اس ۴۷ سالہ جواں ہمت کی خداداد صلاحیتوں سے محروم ہو جانے والی ہے۔ آئندہ کا مؤرخ کیا لکھے گا؟ ---

جسٹس محبوب مُرشد

یہ انٹرویو ۴ جولائی ۶۴ء کو ڈھاکہ میں لیا گیا۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے، میں علی الصباح اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایک خبر نظر سے گزری جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان ہائیکورٹ کے چیف جسٹس جناب مرشد —— نے دانشوروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت قرآن سے رہنمائی اور روحانی فیضان حاصل کرتا ہوں۔ اسی شام جسٹس مرشد سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ کہنے لگے: جس وقت چاہو آجاؤ، یہ گھر آپ ہی کا ہے۔ ہفتے کا دن مقرر ہوا اور میں ۳ جولائی کو جمعے کے بعد سوا دو بجے ڈھاکے کی طرف مائل پرواز تھا۔

میرے ساتھ والی سیٹ پر کیلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر کی اہلیہ بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ تیرہ چودہ سال کی عمر کا لڑکا تھا۔ اُن کے خاوند ایک سال سے ڈھاکے میں ہیں۔ سرسری تعارف کے بعد وہ میرے بارے میں مزید باتیں پوچھنے لگیں:

"آپ کا رسالہ کتنا چھپتا ہے؟"

"پینسٹھ ہزار"

"پاکستان کے لحاظ سے تو یہ بہت بڑی اشاعت ہے۔"

"جی ہاں، اردو زبان میں یہ پاکستان کا سب سے بڑا رسالہ ہے۔"

"ڈھاکے تو آپ کئی دفعہ پہلے بھی جا چکے ہوں گے؟"

"جی نہیں، پہلی بار جا رہا ہوں۔"

میرا یہ جواب سن کر وہ مسکرادیں۔ اس مسکراہٹ میں گہری معنویت تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ پاکستان کے سب سے بڑے رسالے کا ایڈیٹر ـــ اور مشرقی پاکستان کا سفر پہلی بار۔

اس طنز آمیز مسکراہٹ کا زخم کھا کر میں پورے سفر میں خاموش رہا۔ بس ایک ہی زخم کافی تھا۔ جو دل زندگی بھر زخم کھاتا رہا ہو، وہ کتنے زخم اور کھا سکتا ہے؟

ہوائی جہاز کے اکثر مسافر خوش گپیوں میں مصروف تھے، لیکن یہ محترمہ تمام وقت ڈائری لکھتی رہیں اور ان کا لڑکا مسلسل مطالعے میں مصروف رہا۔ ان دونوں نے سفر کے دو گھنٹوں کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ کاش ہمیں بھی وقت کی قیمت کا شعور حاصل ہو جائے!

تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر اترا، تو دل کی کلی مسکرا رہی تھی ـــ محبت، بے آواز جذبے کا نام ہے، یہ خاموشی سے ابھرتا ہے، خاموشی سے آگ بنتا ہے، یہ آگ خاموشی سے اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے۔ سب کچھ جل جاتا ہے، لیکن پتہ نہیں چلتا ـــ صرف اہلِ دل جانتے ہیں کہ محبت کا کارواں اب کس منزل میں ہے۔

اہلِ نظر ڈھاکے کو "خوابوں کا شہر" کہتے ہیں، لیکن جسے کشاکشِ ہستی نے کبھی خواب دیکھنے کی مہلت نہ دی ہو، وہ اس شہر کو کیا کہے؛ پھر کسی موقع پر بتاؤں گا کہ میرے لیے یہ شہر کیا تھا اور میں نے

وہاں کیا دیکھا اور کیا کچھ دیکھنے کی تمنا ہنوز باقی ہے۔

جناب وحید قیصر ندوی کی معیت میں جسٹس مُرشد صاحب سے مُلاقات ہوئی۔ پہلی نظر میں وہ سادہ سے نظر آئے، لیکن جونہی وہ میرے قریب آکر بیٹھے نظروں میں سماتے چلے گئے۔ ان کے حسنِ تکلم سے ان کی نفاستِ طبع اور دلآویز شخصیت جھلک رہی تھی۔ سفید کپڑوں میں ہلکے پھلکے نظر آرہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ دُبلے پتلے جسم میں اعتماد اور عزم کی پختگی، بجلی کی سی تیزی اور اعلانِ عشق کی بے پناہ جرأت موجود ہے۔ ذرا اٹھتا ہوا قد، فراخ پیشانی اور آنکھوں میں امید کی چمک۔ پچاس کا سن ہے، لیکن چالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے۔ علم کی پیاس انہیں کتابوں کے لیے بے چین رکھتی ہے۔ ان کے پاس خاصی بڑی اور عمدہ لائبریری ہے۔ فارسی کے بے شمار اشعار یاد ہیں۔ عربی روانی سے بول لیتے ہیں۔ قرآن کا بڑا حصہ حفظ ہے۔ اردو اور بنگلہ پر یکساں قدرت ہے۔ انگریزی ادب پر پورا عبور حاصل ہے۔ ان کی بیشتر تقریریں اور خطبے ادب کا عمدہ نمونہ ہوتے ہیں۔

ہفتے کے روز انٹرویو نہ ہو سکا، اتوار کی شام کا وعدہ لے کر اٹھا۔ اٹھ کر چلا تو آیا، لیکن جسٹس صاحب کی پیاری شخصیت مجھے گرفتار کر چکی تھی ؎

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

اتوار کی شام کو پانچ بجے، میں جسٹس صاحب کی اقامت گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ گھرے ہوئے بادلوں کی اوٹ میں یہ سُرخ عمارت مثنوی سحر البیان کی رومانی فضا کا منظر پیش کر رہی تھی۔ وہ کتابوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے، مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور متبسم لہجے میں کہنے لگے:

"آج آپ تنہا ہیں۔ کیا آپ کے ساتھی نے ساتھ چھوڑ دیا؟"

پھر آہستہ سے کہا:

"آجکل ساتھ دینا کچھ اتنا آسان بھی تو نہیں۔"

طرزِ ادا کی شگفتگی نے اس جملے کو اور بھی شاداب بنا دیا تھا۔ میں ابھی اس سے لطف اندوز ہو ہی رہا تھا کہ جسٹس صاحب نے اپنی آنکھوں پر سے عینک اتارتے ہوئے کہا:

"یہ زندگی، جو ہمیں بڑی عزیز ہے اور جسے پُرکیف بنانے کے لیے ہم اصولوں کو بھی اس پر نچھاور کر دیتے ہیں اور جس کی خاطر ہم "کئی بار مرلینا" بھی گوارا کرتے ہیں، وہ زندگی بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ زندگی مستعار ہے، اس لیے ہمیں اسے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔" میں نے باتوں کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے راستہ بنایا۔

"جی نہیں، زندگی قدرت کا عطا کیا ہوا سب سے حسین تحفہ ہے، لیکن اس کی اصل قدر و قیمت ہم اپنے افعال سے متعین کرتے ہیں۔ ایمان و ایقان سے لبریز دل، زندگی کو ابدی بنا دیتے ہیں۔ اصول پر چلنے والے قدم، انمٹ نقوش مرتسم کر جاتے ہیں اور جن کو خدا نے عشق کی دولت عطا کی ہے، ان کی خاکستر سے زندگیاں جنم لیتی رہتی ہیں —— اور ایک زندگی وہ بھی ہے جو دولت کی آگ سے روشن ہے اور پھر اسی آگ میں جل کر ختم ہو جاتی ہے۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زندگی میں معاشی خوشحالی کے لیے تگ و دو زندگی کی عظمت کو گھٹا دیتی ہے؟"

جسٹس مرشد صاحب نے چائے کی پیالی کو ہونٹوں سے جُدا کرتے ہوئے کہا:

خوشحالی کا حصُول اپنی ذات میں کوئی بُری بات نہیں، لیکن دولت کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد ٹھہرا لینا یقیناً زندگی کی عظمت کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔ دولت کا پرستار، کبھی کوئی عظمت کی بات نہیں کر سکتا۔ دولت چھن جانے کا خوف اس کے قدموں کو متزلزل رکھتا ہے اور اس کی وابستگیوں کے زاویے بدلتے رہتے ہیں۔"

جسٹس صاحب کی آواز اعتماد کے آہنگ سے پھوٹ رہی تھی اور ذہن کے تانے بانے کو

درہم برہم کیے دیتی تھی۔ واقعی دھن کا پُجاری، ضمیر کے حرم میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جو لوگ وقتی مصالح کے پیشِ نظر زر پرستی کا ذہن پیدا کرتے ہیں، وہ دراصل اپنی موت کا سامان خود کرتے ہیں۔ جب آپ ایک شخص کو دولت کا رسیا بنا دیتے ہیں، تو وہ صرف اتنی دیر تک آپ کے ساتھ رہے گا جب تک اسے کوئی آپ سے زیادہ لالچ دینے والا نہیں ملتا۔ اگر آپ کا دشمن اس کی زیادہ قیمت لگا سکتا ہے، تو وہ آپ کو چھوڑ کر آپ کے دشمن کا ساتھ دے گا۔ ایسے بے ضمیر افراد پیدا کر کے آپ کون سی مہم سر کر سکتے ہیں؟ یہ سوچنے کی بات ہے، لیکن ہم شاید کرگزرنے کے بعد بھی سوچنے کے عادی نہیں۔

"جسٹس صاحب، کیا ہم زر پرستی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں؟"

"چھٹکارا تو حاصل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ خلوصِ نیت سے ہم ایسا کرنا چاہیں۔ دین کا صحیح شعور زر پرستی کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اخلاقی اقدار کا بھرپور احساس انسان کو اتنی اونچی سطح پر لے آتا ہے، جہاں سے دولت ایک حقیر سا نقطہ نظر آنے لگتی ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ اسلام نے ایسے عظیم افراد پیدا کیے اور ایسا صحت مند معاشرہ قائم کیا جس میں سب سے زیادہ اہمیت مقصدِ حیات کو حاصل تھی۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ تو پوری انسانیت کا نچوڑ ہیں، ہم آخری زمانے پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں اورنگ زیب کی عظیم الشان شخصیت نظر آتی ہے۔ پُورے ہندوستان کا فرمانروا ہونے کے باوجود، وہ قرآنِ حکیم کی کتابت کر کے اپنی روزی کماتا تھا۔ میرے پاس اورنگ زیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن ہے۔ جب میں اس کی تلاوت کرتا ہوں، تو نہ جانے میری آنکھوں سے آنسو کیوں ڈھلک آتے ہیں۔ ایسے درویش صفت انسان صرف اسلام ہی پیدا کر سکتا ہے۔"

"جسٹس صاحب، جس دینی شعور کا آپ نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے، وہ کیونکر پیدا ہو سکتا ہے؟"

مرشد صاحب کی برہنہ آنکھیں، عزم و ایقان کی لطیف شعاعوں سے منوّر تھیں۔ اُن کا

چہرہ عقیدت و احترام کی کیفیات کا مظہر تھا۔ ان کے دل میں خاموش طوفان موجزن تھا۔ انہوں نے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنانا چاہا، لیکن الفاظ ساتھ نہ دے سکے۔ پاکیزہ جذبات اپنے ابلاغ کے لیے کسی پاکیزہ دل کی دھڑکنیں تلاش کر رہے تھے۔ میرے دل نے دفورِ شوق میں دھڑکنا چاہا، لیکن گناہوں کے احساس سے دل بیٹھنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے نبض کائنات رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مرشد صاحب کی آواز بلند ہوئی:

خدا کی قسم، حبِ رسُول ؐ کے بغیر ایمانی کیفیت اور دینی شعور بیدار نہیں ہو سکتا۔ اس ذات کی محبت میں ڈوبے بغیر زندگی کا صحیح مفہوم آشکارا نہیں ہوتا اور انسان اپنی حقیقی عظمت سے ناآشنا ہی رہتا ہے۔"

"مرشد صاحب، یورپ نے "عظمتِ آدم" کا جو تصور پیش کیا ہے، کیا وہ عصری تقاضوں کے زیادہ مطابق نہیں ہے؟"

جسٹس صاحب نے تاریخ کے پروفیسر کا سا تجزیاتی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا:

"یورپ میں جو آج علمی، فکری اور سائنسی گھماگھمی نظر آتی ہے، اس کا سرچشمہ مسلمان علماء اور فضلاء ہیں۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے۔ اگر آپ یورپ کے علمی ذخائر کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لیں، تو آپ کو یہ نظر آئے گا کہ عمرانیات پر ابنِ خلدون کے افکار کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ MEDICINE (طب) کے ارتقاء میں بوعلی سینا کا علمی سرمایہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ علمِ نجوم میں وہ ابھی تک عمر خیام سے استفادہ کر رہے ہیں اور اب یہ حقیقت مجھ پر واضح ہوتی جا رہی ہے کہ اصولِ قانون — JURIS PRUDENCE پر ابوحنیفہ کے فکری اثرات بہت گہرے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم یورپ سے اس قدر مرعوب کیوں ہیں اور ہم اپنے مسائل یورپ کے دماغ سے حل کرنے کے بجائے اپنے دماغ سے کیوں نہیں سوچتے۔ کم از کم میں قانون کے متعلق یہ بات پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان فقہاء اتنا بیش قیمت سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ اس پر فخر کیا جا سکتا

ہے اور اس سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"جسٹس صاحب، کیا قانون کا یہ ذخیرہ، جس میں ایک عرصے سے کوئی اضافہ نہیں ہوا موجودہ زندگی کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟"

جسٹس صاحب نے ایک لمحے کے لیے لائبریری کی کتابوں پر نظر دوڑائی اور سر کو قدرے بلند کرتے ہوئے جواب دیا :

"زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ زندگی کی ضروریات اور مسائل میں ارتقا کا اصُول کار فرما نظر آتا ہے۔ جن مسائل سے انسانیت صدیوں پہلے دوچار تھی، وہی مسائل آج ہمیں بھی درپیش ہیں —— مسلم فقہاء نے اپنے اپنے عہد میں کتاب و سنّت اور ماحول کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ان کی کوششوں سے ہم یقیناً فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی مثال دیتا ہوں۔ مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت یورپین ماہرِ قانون کی طرف رجوع کرنے سے پہلے میں اپنے فقہاء کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے فقہاء کے فیصلے اور وہ اصولِ قوانین جن کی بنیاد پر وہ فیصلہ کرتے تھے، یورپ اور امریکہ کے عدالتی نظائر سے زیادہ بہتر ہیں۔ میں عدالتی فیصلوں میں قرآن، سنّت اور فقہ کے حوالے دینا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ آخر ہم کب تک یورپ کی تقلید کرتے رہیں گے؟ ہمیں اپنے اُوپر اعتماد کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔"

اسی ضمن میں مَیں نے ایک نہایت ہی نازک سوال اٹھایا :

"کیا آپ اسلامی قانون میں اجتہاد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟"

مرشد صاحب نے قانون میں فلسفے کا پیوند لگاتے ہوئے کہا :

"ہر زندہ معاشرے کے لیے اجتہاد ضروری ہے۔ اجتہاد نہ کیا جائے، تو معاشرے میں نیا خون پیدا نہیں ہوتا —— لیکن ہم ذہنی بے راہروی کو اجتہاد کا نام نہیں دے سکتے۔ وہ اصول اور مبادی جن کا منصُوص ہونا ثابت ہے، ہم ان میں کوئی تغیر و تبدّل نہیں کر سکتے۔ یہی تو ہماری زندگی

کی عمارت کے بنیادی پتھر ہیں۔ باقی تمام معاملات میں ہمیں غور و فکر کا حق حاصل ہے، لیکن صرف ان لوگوں کو جو قرآن، سنّت اور فقہ کے تمام ذخائر پر گہری نگاہ رکھتے ہوں اور جو نئے نئے مسائل کی ماہیت کو سمجھتے ہوں اور ان کا ایسا حل تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں جو قرآن و سنّت کے مجموعی مزاج سے ہم آہنگ ہو۔ یہ کٹھن کام وہی اربابِ بصیرت کر سکتے ہیں جن کی سیرت و کردار پر اعتماد کیا جا سکتا ہو۔"

جسٹس صاحب، اردو زبان میں فارسی اشعار کی شیرینی گھولتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھار وہ انگریزی زبان بھی استعمال کر جاتے تھے۔ انگریزی لب و لہجہ نہایت رواں اور شستہ تھا۔ اس روانی اور شیرینی سے لطف اٹھاتے ہوئے میں نے ایک بنیادی سوال پوچھا:

"کیا وہ لوگ اِسلامی قانون کی صحیح تعبیر پیش کر سکتے ہیں یا اسے حقیقی روح کے ساتھ نافذ کر سکتے ہیں جن کی زندگیاں اِسلام کے اثرات سے خالی ہوں اور جنہوں نے اس قانون کے مطالعے میں کچھ وقت بھی نہ لگایا ہو؟"

مرشد صاحب نے بلا تامّل جواب دیا:

"ہرگز نہیں، اسلامی قانون کے مطابق وہی لوگ فیصلہ کر سکتے ہیں جن کی سیرت و کردار میں اِسلامی تعلیمات رچی بسی ہوں۔ اسلامی قانون اپنی تعبیر اور نفاذ کے لیے صالح ذہن اور اسلامی مزاج کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر اس قانون کو غیر اسلامی اذہان نافذ کریں گے، تو الجھنوں اور پیچیدگیوں کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

رات کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ بادِ شمیم غنچہ ہائے دل گرفتہ کے راز معلوم کرنے کے لیے رُک رُک کر چل رہی تھی۔ اچانک ایک کلی چٹکی، اس نے صبا کے کان میں کچھ کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کی رفتار تیز ہو گئی۔ شاید کلی نے صبا کو بہت دُور رہنے والے محبوب کے نام کوئی پیغام دیا تھا اور ہوا اِس پیغام کو جلد سے جلد پہنچا دینا چاہتی تھی۔ مجھے خیال

آیا کہ ہوا اِنسانوں سے زیادہ ذمّہ داری اور رازداری کا احساس رکھتی ہے۔

کمرے کی کھڑکی سے باہر کا منظر جوانی کے الھڑپن سے زیادہ حسین تھا۔ میں واقعی کچھ دیر کے لیے اس میں کھو گیا۔ جب خارجی ماحول میں گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں، تو اندر کا پپیہا میٹھے بول الاپنے لگتا ہے۔ ایسے میں مَیں بے اختیار ہو جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ حسن پاکباز میں جذب ہو جاؤں، لیکن ابھی اپنا وجُود راستے میں حائل ہے۔

مجھے جلد ہی جسٹس صاحب کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ اپنے آپ کو سنبھالا، کچھ بھی یاد نہ رہا تھا کہ سلسلۂ کلام کہاں ختم ہوا تھا۔ پانی کا ایک گلاس پیا اور خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ ہم اسلامی قانون پر بات کر رہے تھے۔ اسی موضوع پر میں نے عملی نوعیت کا سوال کیا :

"ہم وہ کونسی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں جن کے ذریعے ہمارے قانون دان حضرات، اسلامی قانون کا صحیح فہم حاصل کر سکیں ؟"

مرشد صاحب کی آنکھوں میں غور و فکر کے ڈورے اُبھر آئے تھے۔ انہوں نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا :

"یہ کام تدریج کا تقاضا کرتا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں اس پُرانے نظام کی طرف لوٹنا چاہیے جس میں چھٹی یا ساتویں جماعت سے ہر طالب علم کے لیے کلاسیکل زبان لینا لازمی تھا۔ اس کا یہ فائدہ تھا کہ طلبہ عربی یا فارسی میں سے ایک زبان ضرور لیتے تھے اور اس زبان میں خاصی سُوجھ بُوجھ پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ سُوجھ بُوجھ آئندہ کی زندگی میں بہت مفید ثابت ہوتی تھی۔ ہمیں پہلے اس نظام کو رائج کرنا چاہیے اس کے ساتھ ساتھ ان طلبہ کے لیے جو آگے چل کر قانون پڑھنا چاہتے ہوں، عربی زبان کو لازمی قرار دے دیا جائے۔ عربی کا نصاب کچھ اس طرح مرتّب کیا جائے کہ بی اے کے طالب علم میں عربی کی اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ کتاب اور سنّت سے براہِ راست استفادہ کر سکے۔ پھر قانون کا نصاب ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں بنیادی حیثیت اسلامی قانون کو حاصل ہو۔ اگر ہم بتدریج یہ اقدامات کرتے

چلے جائیں، تو مجھے امید ہے کہ آئندہ آٹھ دس برس میں ہم ایسے افراد تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو اسلامی قانون کی روح اور اس کے مزاج سے پوری طرح واقف ہوں گے۔"

جسٹس صاحب نے جن تدریجی اصلاحات کا ذکر کیا ہے وہ اربابِ دانش کے لیے لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ہمیں اس سرزمین میں اسلامی قانون کو فی الواقع نافذ کرنا ہے، تو پھر ایسے اقدامات ناگزیر ہیں جن سے وہ دماغ تیار ہوں جو اسلامی قانون کی صحیح تعبیر و تشریح کر سکیں، ورنہ خالی باتوں سے کوئی معجزہ ظہور پذیر نہیں ہوگا۔ یہ کتنے اچنبھے کی بات ہے کہ پوری قوم اسلامی قانون کے لیے تشنگی محسوس کر رہی ہے، لیکن وہ کوئی ایسا عملی قدم نہیں اٹھاتی جس سے یہ تشنگی بجھ سکے۔ ہم شاید اپنے آپ کو کچھ دیر تک اور بے وقوف بنالیں، لیکن باہر کے لوگ ہماری حماقتوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔

اِسلامی قانون پر تفصیلی گفتگو کے بعد میرے ذہن میں عدلیہ کے بارے میں متعدد سوال اُبھر آئے۔ سوالات کے اژدہام میں میرے لیے یہ فیصلہ کرنا خاصا مشکل ہو گیا کہ پہلے کون سا سوال پوچھوں۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے سوال کر دیا:

"جمہوری نظام میں عدلیہ کا سب سے اہم فریضہ کیا ہوتا ہے؟"

"قانون کی بالادستی قائم کرنا" جسٹس صاحب نے برجستہ کہا۔

"لیکن اگر جمہور کے نمائندے ایسے قوانین بنانے لگیں جو قانون کے مسلّمہ تصوّرات سے ہم آہنگ نہ ہوں، تو پھر عدلیہ کیا رول ادا کرتی ہے؟"

مرشد صاحب نے مجھ پر بھرپُور نگاہ ڈالی، دو چار لمحوں کے لیے کچھ سوچا اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہنے لگے:

"ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ قانون کی تشریح انصاف کے تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ ہم قانون کے خلاء کو نظائر سے پُر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ہمارا مطمح نظریہ ہوتا ہے کہ قانون میں احترامِ انسانیت کی روح جاری و ساری ہو، کیونکہ اس رُوح کے بغیر قانون کو اچھا قانون نہیں

کہا جا سکتا۔ دراصل قانون اور جج کے درمیان بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جج کی عظمتِ شخصیت، قانون کو بلند تر کر دیتی ہے اور اس کے آزاد فضا میں دیئے ہوئے فیصلے قانون کو انصاف کا مظہر بنا دیتے ہیں۔"

جسٹس مرشد صاحب کی خیال افروز باتیں میرے ذہن کو روشن کرتی جا رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ جج کا فریضہ کتنا مقدس اور نازک ہے۔ یہ نزاکت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جج کو آزاد فضا میں سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے۔ اس کی ذہنی افتاد، اس کا فکری تقاضا اور اس کا شخصی کردار قانون کی بالادستی قائم کرنے میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سوسائٹی میں وہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

عدلیہ میں انصاف کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس لیے میں نے جسٹس صاحب سے سوال کیا کہ "آپ کے ذہن میں عدل و انصاف کا بنیادی تصور کیا ہے"؟ انہوں نے سر کو ایک خاص انداز میں جنبش دیتے ہوئے کہا:

"میں نے عدل کا تصور قرآن کے ایک لفظ "میزان" سے اخذ کیا ہے۔ میزان کے دو پلڑے ہوتے ہیں۔ اس سے میں نے یہ استنباط کیا کہ اس وقت تک انصاف نہیں ہو سکتا جب تک فریقین کے دلائل نہ سُنے جائیں اور دونوں کو اپنی صفائی کا پُورا موقع نہ دیا جائے۔ صفائی کا موقع دیے بغیر کسی شخص کے خلاف قانون کو حرکت میں لانا یا یک طرفہ فیصلہ دینا، میزان کے تصور کے خلاف ہے۔ میں انصاف کے اسی تصور کو سب سے زیادہ جامع اور انسانی وقار کے مطابق سمجھتا ہوں۔"

جسٹس صاحب، آپ نے مختلف نظامہائے قانون کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ آپ کو کس نظامِ قانون میں عدلیہ سب سے زیادہ آزاد اور باوقار نظر آئی؟"

مرشد صاحب کی کشادہ پیشانی پر سوچ بچار کی شکنیں ابھر آئیں جیسے وہ مختلف نظامہائے قانون کا تقابلی موازنہ کر رہے ہوں۔ ایک دو منٹ بعد ان کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے

اعتماد کی ایک خاص ادا کے ساتھ کہا :

"میں یہ پوری دیانت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ اسلام نے عدلیہ کو جو آزادی اور وقار عطا کیا ہے، وہ کسی اور نظام میں موجود نہیں۔ میں اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے ایک تاریخی واقعہ سناتا ہوں۔ یہ واقعہ اگرچہ اسلامی تاریخ کی اکثر کتابوں میں ہے، لیکن میں لین پول کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ہمارے ملک میں بعض اذہان ایسے ہیں جو یورپی مورخین کے سوا کسی کو مستند نہیں سمجھتے۔ واقعے کی تفصیلات کچھ یوں ہیں :

کسی شخص نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا۔ جس مقام پر یہ مقدمہ دائر کیا گیا، صلاح الدین وہاں سے سینکڑوں میل دور تھا۔ قاضی نے سلطان کو اپنی عدالت میں طلب کیا۔ صلاح الدین منزلیں طے کرتا ہوا عدالت میں حاضر ہوا۔ قاضی نے فریقین کی باتیں سنیں اور فیصلہ صلاح الدین کے خلاف سنایا۔ مقتدرِ اعلیٰ اپنے خلاف فیصلہ سننے کے بعد خوشی سے کھل اٹھا اور اپنا چوغہ اتارتے ہوئے قاضی سے مخاطب ہوا :

"اے قاضی ! اگر تم فیصلہ میرے حق میں کر دیتے، تو اس تلوار سے، جو میں نے چوغے کے اندر چھپا رکھی تھی، تمھاری گردن اڑا دیتا"۔ قاضی نے یہ سن کر فرش کا ایک کنارا اٹھایا اور بلا خوف و خطر کہا :

"اگر تم عدالت کے فیصلے کے خلاف سرتابی کرتے، تو اس دُرّے سے تمہارا بدن لہولہان ہو چکا ہوتا"۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ یہ قانون کی حکمرانی کی سب سے عمدہ مثال ہے۔ جس نظام میں عدالت کا اتنا اونچا تصور ہو اور جس میں وقت کے فرمانروا کو ایک عام شہری کی حیثیت دی گئی ہو، اس سے بہتر اور کون سا نظام ہو سکتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں عدلیہ کی آزادی کا بڑا غلغلہ ہے، مگر اس آزادی کو اسلام کی دی ہوئی آزادی سے کیا نسبت ہے؟"

میں نے اسی موضوع پر آخری سوال کیا :

"کیا قانون مجرد اپنی طاقت سے سوسائٹی میں اِصلاحی کردار ادا کرسکتا ہے ؟"

"جی نہیں، قانون کے پیچھے جب تک مضبوط اخلاقی قوت نہ ہو، اس وقت تک دُور رس نتائج برآمد نہیں ہوسکتے۔ قانون کے لیے احترام، اخلاقی قوت ہی پیدا کرتی ہے۔ اخلاقی قوت سے بے نیاز ہوکر جتنے قانون بھی وضع کیے جائیں گے، وہ دلوں پر حکومت نہیں کرسکیں گے۔ قانون کو کم سے کم معاملات میں دخل دینا چاہیے اور زیادہ امُور کو اخلاقی حس پر چھوڑ دینا چاہیے۔ قانون کا شکنجہ جتنا زیادہ سخت ہوتا ہے، لاقانونیت اتنی ہی زیادہ اندر ہی اندر راہ پاتی رہتی ہے۔"

گھڑی کی سُوئی آٹھ پر تھی۔ رات کے بہتے دریا میں کسی کی زُلف سیاہی گھول رہی تھی۔ اس اندھیرے سے گھبرا کر خیال گزرا کہ مرشد صاحب کی زندگی سے روشنی حاصل کی جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوُسروں کی پاکیزہ زندگی کو دیکھ کر اپنی سیہ کاریوں پر ندامت ہونے لگتی ہے اور کیا معلوم ندامت و شرمساری کا یہی احساس خدا کو پسند آجائے۔

اِتنے میں مرشد صاحب کا ملازم دروازے پر آیا۔ مرشد صاحب نے اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا :

"خدا حافظ !"

میں اب مرشد صاحب کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس وقت مجھے جسٹس کیانی مرحوم کا وہ فقرہ یاد آیا جو انہوں نے اس وقت کہا تھا جب میں نے ان سے حالاتِ زندگی کے بارے میں پوچھا تھا :

"لوگوں کو میرے حالاتِ زندگی سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے، انہیں خشک رُوداد سنا کر بور نہ کیجیے۔"

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا :

"کیا میں مرشد صاحب کے حالاتِ زندگی شائع کرکے قارئین کے صبر کا امتحان لوں گا ؟"

وجدان نے نفی میں جواب دیا۔ زندگی کی رُوداد ہمیشہ دلچسپ ہوتی ہے، خصُوصاً اُن لوگوں کی روداد جو تند و تیز ہوا کے تھپیڑوں میں چراغ جلانے کا حوصلہ رکھتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ نہ جانے کون سا تھپیڑا شمع حیات کو گُل کر دے ــــــــــــــــــــ

میں نے مرشد صاحب سے پُوچھ ہی لیا :

" آپ کی شخصیت بنانے میں کن کن لوگوں کا حِصّہ ہے ؟ "

مرشد صاحب میرے سوال کو سُن کر یک دم خاموش سے ہو گئے۔ وہ شاید گزرے ہوئے واقعات کو ترتیب دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ماضی، ہمیشہ حال سے زیادہ حسین نظر آتا ہے۔ شاید اس لیے کہ وقت عہدِ ماضی کے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے اور حال کے زخم ابھی تازہ ہوتے ہیں ــــ ویسے بھی بچپن کا زمانہ آزادیوں اور بے فکریوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ آزادی کا رُوپ کتنا سہانا ہوتا ہے۔

مرشد صاحب ماضی کی یادوں کا سہارا لیتے ہوئے بولے :

" میں ۱۹۱۳ء میں بھاگل پور (مغربی بنگال) کے مقام پر پیدا ہوا۔ میری شخصیت کے بنانے میں سب سے زیادہ حِصّہ میرے خاندانی اثرات کا ہے۔ خاندان کے مورثِ اعلیٰ سادات میں سے تھے اور شاہجہان کے عہد میں فقیہہ کی حیثیت سے یہاں آئے تھے۔ قال اللہ و قال الرّسُول میں انہوں نے ساری زندگی گزاری۔ میرے والدِ بزرگوار، عبدالسالک سلوک و طریقت کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔ میری زندگی پر ان کا بہت گہرا اثر ہے۔ انہوں نے انگریزی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی، وہ اس وقت کمشنری کے عہدے پر فائز تھے۔ میں نے اُن کی زندگی کو بہت باقاعدہ پایا۔ صبح کے وقت قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ یہ انہی کا فیض ہے کہ میں بھی باقاعدگی سے قرآن کی تلاوت کرتا ہوں، ورنہ ہم جس ماحول میں گھرے ہوئے ہیں اس میں اس کے لیے کہاں گنجائش ہے۔ تمام دن کی دفتری مصروفیات کے بعد وہ عصر کی نماز سے لے کر مغرب کی نماز تک اپنے شیخ کی صحبت میں رہتے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہمارے گھر علماء،

فضلاء، اور اہلِ تصوّف جمع رہتے تھے۔

"وہ ایک علحدہ کمرے میں عبادت کیا کرتے تھے۔ میرا اُس کمرے کے پاس سے جب بھی گزر ہوتا، میں انہیں زار و قطار روتے ہوئے دیکھتا۔ ان مناظر نے میرے دل میں خشیتِ الٰہی کا احساس راسخ کردیا۔ مجھے اب جب کبھی والد ـــــ ـــ ـــ ـــ کا چہرہ آنسوؤں میں دُھلا ہوا یاد آتا ہے، تو مجھ پر رقّت طاری ہوجاتی ہے۔

ان کی ایک اور خوبی جس نے میری تشکیلِ سیرت میں نمایاں حصّہ لیا، وہ صبر و استقامت کی بے پناہ قوت تھی۔ میں نے انہیں مصائب میں ہراساں ہوتے نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا دل عطا کیا تھا کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی دامنِ ضبط ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

انہوں نے گھر میں ایک اور اچھی روایت قائم کی تھی۔ وہ ہمیں اس بات کی پوری آزادی دیتے تھے کہ ہم آداب کی حدود میں رہتے ہوئے ان کے افعال و نظریات کے بارے میں کھل کر بات کرسکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں ہمارے مزاج میں جمہوری روایات کو نشو و نما پانے کا موقع مِلا، وہاں ہمارے دلوں میں والد صاحب کے لیے بے پناہ محبت و احترام پیدا ہوا۔ خوف، نفرت کو جنم دیتا ہے اور آزادی حقیقی احترام کی خالق ہے۔

والد صاحب اس بات پر خاص زور دیا کرتے کہ اِنسان اپنی اخلاقی اقدار سے پہچانا جاتا ہے۔ سب سے اچھا انسان وہ ہے جس میں نیکی اور بدی کی تمیز موجُود ہے۔ جب کبھی زندگی میں حالات کے نشیب پر لڑھکنے لگتا ہوں، تو والد صاحب کا مقولہ یاد آجاتا ہے اور قدم آگے بڑھنے سے رُک جاتے ہیں۔

والد صاحب کے بعد جو لوگ میری زندگی پر اثر انداز ہوئے، وہ علماء اور صوفیاء تھے۔ مجھے ان کی صحبت میں رہنے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا۔ اُن کا علمی تبحر، ان کی سادگی اور عشقِ رسُول میں ڈوبے رہنے کی کیفیت اور اُن کی وسعتِ قلبی میں کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا۔ ان بزرگوں کے

طفیل مجھے فارسی اور عربی سے شغف پیدا ہوا اور انہی کے فیض سے دین کا شعور پختہ ہوا۔
انگلستان کے دورانِ قیام میں (۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک) میں نے جمہوریت کا بنیادی تصوّر عملی زندگی میں چلتے پھرتے دیکھا اور اس مشاہدے سے میرا جمہوریت پر یقین اور پختہ ہو گیا۔ فرد کی آزادی کا جیتا جاگتا شعور میں وہیں سے لے کر آیا ہوں اور یہ شعور میری زندگی کا جُزوِ لاینفک بن گیا ہے۔ مجھے فرد کی آزادی میں تقدّس نظر آتا ہے اور اس تقدّس کی حفاظت میری سب سے بڑی ذمّہ داری ہے۔"

مرشد صاحب کی کتابِ زندگی کے ابواب دلچسپ بھی ہیں اور ایمان افروز بھی اور یہ ان ان لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں جن کے ہاتھ میں موجودہ نسل کی قیادت ہے، لیکن آجکل ذمّہ داری کی بات کون سُنتا ہے، صرف حقوق کی بات کیجیے۔ یوں تو اپنا حق لینا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ذمّہ داری کو ادا کرنا، لیکن حقوق پر ذمّہ داریوں کو تقدّم حاصل ہے۔ لوگ باگ عموماً اس نکتے کو فراموش کر دیتے ہیں جس کی بنا پر زندگی میں توازن قائم نہیں رہتا۔

"مرشد صاحب، آپ کو کن کن کتابوں نے متاثر کیا؟"

"کتاب اللہ اور کتبِ احادیث کے بعد میں "احیاء العلوم"، "فتوح الغیب" اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اقوال سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ سیرت النبیؐ میرا محبوب ترین موضوع ہے اور میں زیادہ تر آنحضرت کے شمائل کا مطالعہ کرتا ہوں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے ایک نہایت ہی نازک سوال پُوچھ لیا:

"کسی ایسے مقدمے کی روداد سنائیے جسے آپ اپنی زندگی کا سب سے اہم مقدمہ سمجھتے ہیں؟"

"ہمارے لیے ہر مقدمہ اہم ہے۔ جو بھی مقدمہ ہمارے سامنے آتا ہے، اس میں ہمارے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں لغزش نہ آجائے۔ آخر ایک دن ہم کو خدا کے حضور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔"

سوا آٹھ بج رہے تھے اور میں مرشد صاحب سے آخری سوال پُوچھ رہا تھا:

"کیا آپ امریکہ بھی گئے ہیں؟"

"جی ہاں، میں امریکہ گیا ہوں۔"

"آپ کو وہاں کی کوئی چیز پسند آئی؟"

...... ایک لمحے کے لیے رُکتے ہوئے بولے:

"جی ہاں، ان کی تاریخ کا وہ دَور بہت پسند آیا جس میں انہوں نے انگریزی استعماریت کے خلاف جدّوجہد کی تھی۔ اس سرزمین میں انگریزی استعماریت ہندوستان سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ اس قوم میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی، بے سروسامان جیالے آگے بڑھے، سنگینوں نے ان کا راستہ روکنا چاہا، لیکن آزادی کے شیدائی سینوں پر زخم کھا کھا کر آزادی کے نقش ونگار بناتے چلے گئے۔ امریکا کا اعلانِ آزادی دنیا کے چند اچھے اعلانات میں سے ایک ہے اور اسے پڑھکر ایک نئی اُمنگ اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب کبھی کوئی طاقت ظلم وتشدّد کے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتی ہے، تو بے بس اور پسے ہوئے طبقے اس طاقت کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ دراصل کسی طاقت کا تشدّد پر اتر آنا اس بات کی علامت ہے کہ زوال نے اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ تاریخ کے کسی حصّے میں بھی تشدّد کو زیادہ عمر نصیب نہیں ہوئی۔"

ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ مرشد صاحب نے کسی اور صاحب کے لیے یہ وقت رکھا تھا۔ بادلِ ناخواستہ اُٹھا، اجازت لی اور فلر روڈ کی تاریکیوں میں گم ہوگیا۔ میرے کانوں میں مرشد صاحب کے وہ الفاظ بار بار اُبھر رہے تھے جو انہوں نے اپنے ملازم کو اجازت دیتے وقت کہے تھے: "خدا حافظ اچھّے خاندان میں اچھی روایات قائم ہوتی ہیں اور اچھّے ماحول میں پلے ہوئے افراد اچھے کام کر جاتے ہیں۔ جب کبھی مرشد صاحب کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے، تو میں یقین اور امّید کا پیکر بن جاتا ہوں۔ میرا الجھا ہوا دل شگفتگی حاصل کر لیتا ہے اور زندگی کو اعلیٰ نصب العین کے لیے وقف کر دیتے کا عزم کروٹ لینے لگتا ہے۔ مرشد صاحب کا یہ عطیہ میں اپنی قوم کی خدمت

میں پیش کرتا ہوں، دیکھیے کتنے رہروانِ شوق اسے لینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

یہ انٹرویو ۱۴، ۱۵ اکتوبر ۶۳ء کو لاہور میں لیا گیا۔

آج سے تقریباً سترہ برس پہلے میری عمر بارہ تیرہ سال کی تھی اور مَیں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ سال کے وسط میں ہماری جماعت کے لیے ریاضی کے نئے اُستاد آئے۔ ان کا نام چودھری نظام الدین تھا۔ ان کی شخصیت نہایت سادہ لیکن بے حد جاذب تھی۔ میں ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ میں اکثر ان کے گھر آتا جاتا تھا۔

چودھری صاحب کو اُردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور مجھے بھی بچپن ہی سے شعر و ادب سے دلچسپی تھی۔ ہم اکثر ادبی، علمی اور دینی مسائل پر ہلکی پھلکی گفتگو کرتے۔ یہ گفتگوئیں مجھے اچھی اور معلوماتی کتابوں کے مطالعے پر اُبھارتی رہتی تھیں۔

اکتوبر کی ایک صبح، مَیں نماز پڑھتے ہی چودھری صاحب کے گھر چلا گیا۔ وہ چولھے پر چائے

تیّار کر رہے تھے جب چائے تیّار ہوگئی تو انہوں نے مجھے چائے کی پیالی دی اور خود بھی پینے لگے اور پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا میں دورانِ گفتگو میں پوچھ بیٹھا:

"آپ کے نزدیک آج کل اُردو کا سب سے اچھا نثر نگار کون ہے؟"

"سیّد ابوالاعلیٰ مودُودی"۔ چودھری صاحب نے بلا تامّل جواب دیا۔

پھر انہوں نے ہاتھوں کو خاص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا:

"وہ اس انداز سے لکھتا ہے کہ آگ لگاتا چلا جاتا ہے"۔

نظام الدّین صاحب کے یہ فقرے غیر شعوری طور پر میری کتابِ ذہن پر منقّش ہوگئے۔

میں سکول کے کام سے فارغ ہو کر مودُودی صاحب کی کتابیں پڑھتا اور چودھری صاحب ان کتابوں کے متعلق مجھ سے پوچھتے رہتے۔ اسی طرح دو تین سال گزر گئے۔ پاکستان بنا اور ہم وقتی طور پر نواں کوٹ لاہور کے گرد و نواح میں آکر ٹھہرے۔ غالباً یہ ۱۹۴۸ء کا آغاز تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ مودودی صاحب سردار پورہ اچھرہ کی مسجد میں مغرب کی نماز کے بعد درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ان دنوں میرے پاس سائیکل بھی نہ تھی۔ نواں کوٹ سے پیدل سردار پورہ پہنچا۔ مودودی صاحب کو دیکھنے کے لیے میری نگاہیں تمام نمازیوں کا طواف کر رہی تھیں۔ نماز کے بعد مولانا نے درس کا آغاز سورۂ بقرہ سے کیا۔ وہ میرے اس تصوّر کے قریب قریب نکلے جو میں نے اُن کے بارے میں برسوں سے قائم کر رکھا تھا۔ مودُودی صاحب سے پہلی بار تفسیرِ قرآن سُن کر مجھے کچھ مایوسی ہُوئی۔ نہ زورِ خطابت، نہ فلسفہ و حکمت کی باتیں، نہ عربی کی لمبی لمبی اور طویل عبارتوں کے حوالے۔ بس قرآن کے مفاہیم کا سیدھا سادہ اور مختصر بیان، میں مسلسل درس میں شریک ہوتا رہا اور میرے ذہن کے سانچے ٹوٹتے، پگھلتے اور نئے انداز میں ڈھلتے رہے۔

مجھے تلاشِ معاش میں لاہور سے باہر جانا پڑا اور زندگی کے جھمیلوں میں اتنا گھر گیا کہ کچھ یاد نہ رہا۔ چار پانچ سال یہی کیفیت رہی۔ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں قدرت مجھے پھر لاہور لے آئی۔ یہ

اُن دنوں کی بات ہے جب لاہور، مارشل لاء کی آہنی گرفت میں تھا اور ملک کی سیاسی فضا میں اضطراب اور بے چینی کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ ۱۲ مئی ۱۹۵۳ء کی صبح کو اخبار آیا تو میری نگاہ اس سُرخی پر جم گئی۔

"فوجی عدالت نے ابوالاعلیٰ مودُودی کو سزائے موت دینے کا فیصلہ سنا دیا۔"

مجھے دفعتاً ماضی کے تمام واقعات یاد آگئے۔ مودُودی صاحب کا باوقار، سُرخ و سپید اور شگفتہ چہرہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ نجانے میرا اضطراب ہر لحظہ کیوں بڑھ رہا تھا۔ میں اسی عالم میں سیر کے لیے نکل کھڑا ہُوا۔ مسلم ٹاؤن کے قریب سے جو نہر گزرتی ہے، اس کے کنارے ٹہلتا رہا۔ میرا ہر قدم بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے مودودی صاحب سے کچھ زیادہ عقیدت بھی نہیں تھی، لیکن دل کہہ رہا تھا کہ ایسے بلند پایہ نثر نگار اور جیّد عالم دین کو اس انداز سے سزائے موت دینا صریحاً زیادتی ہے۔ دل کی یہی آواز شعروں میں ڈھلنے لگی اور وہیں پندرہ بیس منٹ میں ایک غزل موزوں ہو گئی:-

وہ اور ہی ہوں گے کم ہمّت جو ظلم و تشدّد سہہ نہ سکے
شمشیر و سناں کی دھاروں پر رُودادِ صداقت کہہ نہ سکے

اک جذبِ حصولِ مقصد نے یوں حرص و ہَوا سے پاک کیا
ہم کفر کے ہاتھوں بک نہ سکے اور وقت کی رَو میں بہہ نہ سکے

جس بات سے تم نے روکا تھا اور دار پہ ہم کو کھینچا تھا
مرنے پہ ہمارے عام ہُوئی، گو جیتے جی ہم کہہ نہ سکے

یہ چشمِ فلک نے دیکھا ہے طاقت میں جو تم سے بڑھ کر تھے
توحید کا طوفاں جب اٹھا وہ مدِّ مقابل رہ نہ سکے

الطاف محبّت اور ہے کیا، جز سوزِ دروں، جز دردِ نہاں
وہ پچھلے پہر کی آہیں ہیں جو آنکھ سے آنسو بہہ نہ سکے

میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اشکوں کا یہ سیلاب کسی طرح رکتا نظر نہ آتا تھا۔ میں نہر کے پل پر بیٹھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ حالانکہ اس سے پہلے اپنی عزیز بہنوں کی موت پر آنکھ میں ایک قطرہ بھی نہ آیا تھا۔

اسی ذہنی کرب اور اذیت میں پانچ چھ روز گزر گئے۔ اب صرف ایک ہی زبردست خواہش دل میں جاگزیں تھی کہ مودودی صاحب کو ایک نظر دیکھا جائے۔ میں نے جیل میں ان سے ملاقات کرنے کا انتظام کرلیا۔ ہم چار پانچ ساتھی مودودی صاحب کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے وہ خاص لباس زیب تن کر رکھا تھا جو موت کی سزا پانے والے قیدیوں کو پہنایا جاتا ہے۔ ہم سب افسردہ اور مایوس تھے۔ اور ہمارے چہروں پر موت کی سی اداسی پھیلی ہوئی تھی لیکن مودودی صاحب کے بشرے پر امید کی شفق اور تبسم کی افشاں دمک رہی تھی۔ میں عالمِ حسرت و یاس میں پکار اٹھا:۔

"مولانا، اب کیا ہوگا؟"

مودودی صاحب نے ٹھہرے ہوئے اور پُراعتماد لہجے میں جواب دیا:۔

"اللہ تعالےٰ مجھے زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے زندگی نہیں چھین سکتی اور اگر میرا وقت آن پہنچا ہے تو پھر مجھے کوئی بھی زندگی نہیں بخش سکتا۔ اس میں گھبرانے کی بات ہی کیا ہے؟"

ان لفظوں نے میرے جسم میں ہمت و عزیمت کی برقی رَو دوڑا دی اور میں وہاں سے زندگی کی توانائیاں اور قوتیں اور ایک نیا عزم لے کر واپس آیا۔

اس سے پہلے یہ خبر آچکی تھی کہ مودودی صاحب نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کردیا ہے اور اس خبر کے کچھ دنوں بعد یہ خبر بھی آئی کہ ان کی سزائے موت عمر قید کی سزا میں تبدیل ہوگئی ہے، لیکن قدرت کی حکمتیں نرالی ہیں۔ مودودی صاحب تین سال سے پہلے ہی رہا ہو کر

باہر آگئے۔ اس وقت یہ شعر بے اختیار میرے ہونٹوں پر آگیا تھا ؎

سزا کی طرح نئی ڈالیئے کہ دیوانے
مقامِ دار و رسن سے گزر کے آئے ہیں

مودُودی صاحب کی اس بلندیٔ کردار اور بے مثل استقامت نے میرے ذہن پر بہت گہرا اثر چھوڑا، لیکن اس تاثر پر وقت کی تہیں جمتی چلی گئیں، تاہم ابھی ایک آدھ چنگاری باقی تھی اور اسی چنگاری کی حرارت نے میرے ذہن میں مودودی صاحب سے انٹرویو لینے کی تحریک پیدا کی۔

مودُودی صاحب کے لیے سوالنامہ مرتّب کرتے وقت مجھے خاصی دقّت پیش آئی۔ وہ ممتاز مفکّر، جیّد عالمِ دین، صاحبِ طرز نثر نگار، منظّم سیاسی جماعت کے سربراہ، زبردست معاشرتی مصلح کی حیثیت سے معروف ہیں اور پھر ان کی یہ ساری حیثیتیں ایک بڑی حیثیت میں مدغم ہو گئی ہیں۔ وہ بڑی حیثیت داعیِ اسلام کی ہے۔ میں نے پہلے فیصلہ کیا کہ سیاست کے موضوع کو گفتگو سے قطعی طور پر خارج رکھا جائے اور صرف "غیر سیاسی" باتیں کی جائیں کیونکہ ہمارے ملک کی فضا "سیاسی تذکروں" کے لیے سازگار نہیں اور ہمیں سیاست کے پیچ وخم کا شعور ہی کب ہے۔ پھر سوچا یہ ادب بھی غیر ضروری سا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے قوم کو بے عملی کے انجکشن لگانے کے سوا اور دیا ہی کیا ہے اور اسلام —— اس پر بھی باتیں سوچ سمجھ کر ہی کرنی چاہیئں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ باتیں ہمارے بین الاقوامی تعلقات پر اثر انداز ہو جائیں۔ اور ہمارے ملکی مسائل —— یہ تو سب حل ہو چکے، ان پر آخر کیا گفتگو کی جائے۔ میں اسی فکر میں غلطاں تھا کہ خیال کی ایک اور رَو اُبھری۔

"زندگی ایک مربوط تسلسل کا نام ہے۔ اسے اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی ایک پودے کی مانند ہے جسے اپنی نشوونما کے لئے افکار کا رس، شعروادب کی شبنم، سیاست

کی تمازت اور سر پھروں کا خونِ جگر درکار ہے۔ ان میں سے کسی ایک چیز کو نکال دیجئیے، زندگی کا پودا مرجھا ہی تو جائے گا۔" اس خیال کے آتے ہی میں نے "بھرپور" سوالنامہ مرتب کیا اور تین نشستوں میں مودودی صاحب سے سوالات کے جوابات حاصل کیے۔ انٹرویو کے دوران میں ان کی شخصیت کے کئی چھپے ہوئے گوشے اجاگر ہوئے۔ ایسے گوشے جو بعض حضرات کے لیے دلچسپ ہوں گے اور بعض کے لئے مایوس کن اور کچھ کے لیے حیرت زا۔ میرا تاثراتی احساس اِن تینوں احساسات سے جُدا ہے، لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس احساس کا نام کیا ہے۔

مودودی صاحب، ہمیں (میرے ساتھ تین ساتھی اور تھے) اپنے ملاقات کے کمرے میں لے گئے۔ معلوم ہوتا ہے یہ کمرہ ان کا سٹڈی رُوم بھی ہے، آفس بھی اور لائبریری بھی —— کمرے کے اندر چاروں طرف الماریاں تھیں جن میں مختلف زبانوں کی ضخیم اور نایاب کتابیں قرینے سے رکھی تھیں۔ کمرے کے مرکز میں ایک بڑی میز بچھی ہوئی تھی جس پر کتابیں، رسالے اور لکھنے پڑھنے کے کاغذات ترتیب اور سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ صاف ستھرا، خاموش اور سادہ کمرہ مکین کی چند صفات وخصائص کا پتہ دے رہا تھا۔ صفات اور خصائص کے خاکے میں رنگ آپ اپنے ذوق اور پسند کے مطابق بھر لیجیے، کیونکہ یہاں ایسے اشخاص کی کمی نہیں جنھیں "بے ترتیبی" میں "حسن" اور "انتشار" میں "سلجھاؤ" نظر آتا ہے اور جن کے نزدیک "قرینہ" ہی زندگی کے جسم کا سب سے بڑا ناسُور ہے۔

اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں نے مودودی صاحب سے سب سے پہلے وہی سوال کیا جو میں ہر "عظیم شخصیت" سے سب سے پہلے کرتا آیا ہوں، یعنی:

" ابتدائی زندگی کے دلچسپ واقعات، والدین کی تربیت کا تشکیلِ سیرت پر اثر —— اور بچپن کی معصوم خواہشیں"۔

مولانا نے قدرے "پس وپیش" کے ساتھ کتابِ زندگی کے چیدہ چیدہ اوراق پلٹنے

شروع کیے۔

"میں نے ۱۹۰۳ء میں اورنگ آباد (انڈیا) کے مقام پر ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو برصغیر پاک و ہند میں انگریزی طرزِ زندگی اختیار کرنے میں پیش پیش تھا۔ علی گڑھ کالج کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے سر سیّد احمد خاں نے ایک "مدرسۃ العلوم" قائم کیا تھا۔ میرے والد مرحوم اس مدرسے کے اوّلین طلبہ میں سے ایک تھے، اور وہ قدرتی طور پر سر سیّد کی تحریک سے بہت متاثر تھے، لیکن ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۳ء کے درمیانی وقفے میں ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ اس مغربی تعلیم نے ان کی زندگی کو اسلام کے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اس احساس کی بدولت ان میں ایک عظیم انقلاب رُونما ہوا۔ وہ اب مغربی تہذیب اور اس کی اخلاقی قدروں سے سخت متنفر ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی کو مغربی اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی اور بعد ازاں اس معاملے میں اتنا سخت رویہ اختیار کیا کہ مجھے مدّت تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہیں انگریزی بھی آتی ہے، تاہم جدید تعلیم کی وجہ سے جو خاص قسم کی ستھرائی پیدا ہو جاتی ہے، وہ آخر وقت تک باقی رہی۔

"مولانا" میں نے بات کاٹتے ہوئے پُوچھا۔ "آپ کو معلوم ہے اُن میں یہ انقلاب کیونکر آیا؟"

مودُودی صاحب نے آہستہ سے کھنکھارتے ہوئے جواب دیا:

"میں قطعیت کے ساتھ تو کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میرے بڑے بھائی نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ تاہم میرا یہ اندازہ ہے کہ دینی کتب کے مطالعے سے انہیں یہ احساس ہوا کہ ان میں کیا تغیرات رونما ہو گئے ہیں۔"

مولانا ایک نرم رَو جُوئے آب کی مانند آگے بڑھ رہے تھے۔

"میرے خاندان کے متعلق دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں اس خاندان کو سخت دشواریوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کے تشدّد نے اس خاندان کے افراد میں انگریزوں کے خلاف شدید جذبۂ نفرت پیدا کر دیا تھا۔ اسی رچے بسے جذبے کے تحت

والد مرحوم انگریزی ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ اس ماحول میں پروان چڑھنے کے باعث میرے دل میں انگریزی ملازمت کی طرف کبھی میلان پیدا نہیں ہوا۔

والد مرحوم میری تربیت پر خصوصی توجہ دیتے، میری زبان اور اخلاق کو معیاری، ستھرا اور پاکیزہ بنانے کی انتہائی کوشش کرتے۔ راتوں کو مجھے پیغمبروں کے قصّے، تاریخ اسلام اور تاریخِ ہند کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے اور وہ میری عادات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی ملازمہ کے بچّے کو مارا تو انھوں نے اس بچّے کو بلا کر کہا کہ تو بھی اسے مار۔ مجھے اس سے ایسا سبق ملا کہ پھر تمام عمر میرا ہاتھ کبھی کسی زیر دست پر نہیں اٹھا۔"

مولانا کے آخری لفظوں نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے ماضی کے نشانات دیکھے۔ کتنے اچھے تھے وہ والدین! بچّوں کی تربیت ان کے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا اور ہماری اس نئی پود کے والدین —— اُف توبہ! —— بچّوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ان کے فرائض ہی میں شامل نہیں۔ انہیں زر پرستی اور عیش کوشی سے اتنی فراغت کہاں نصیب کہ بچّوں کی ذہنی و اخلاقی درستی اور اصلاح کی طرف متوجّہ ہوں۔ وہ فلمی گانوں کی لوریاں دے کر بچّوں کو سُلاتے ہیں۔ وہ ریڈیو کی دُھنوں پر مٹکتے، تھرکتے اور رقص کرتے ہیں۔ قرآن، سُنّت اور علمائے کرام کے اقوال سے بچّوں کے کان نا آشنا رہتے ہیں۔ وہ ذرا بڑے ہوتے ہیں تو نرسری اور کنڈر گارٹن کے سبز باغوں میں داخل کر دئے جاتے ہیں جہاں وہ اسلامی تعلیمات کے سوا اور سب کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ خوشحال گھرانوں کے بچّوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ تم حکم چلانے کے لیے پیدا ہوئے ہو اور خادموں اور ملازموں پر تشدّد کرنے ہی سے وقار اور رعب قائم رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے والے کتنے بچّے خدا ترس اور نیک سیرت انسان بن سکیں گے؟

مولانا اپنی مخصوص دھیمی آواز میں میرے سوالات کا جواب دیے جا رہے تھے۔

آغازِ تعلیم کے متعلق مولانا نے بتایا: گھر پر عربی پڑھی۔ سکولوں اور کالج میں مختلف علوم زیرِ مطالعہ

رہے۔ انگریزی زبان کی استعداد تعلیمی دَور کے بعد حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے کا مجھے کوئی خاص واقعہ یاد نہیں۔ مَیں ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا اور میرے ذہن نے کبھی بھی مستقبل کا کوئی حسین خاکہ نہیں بنایا، البتہ اس دَور میں مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ مجھ میں لکھنے کی صلاحیّت موجود ہے۔

جب مَیں کالج کی تعلیم سے فارغ ہوا تو اس وقت میری عُمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ اس کے بعد میں نے "آوارہ خوانی" شروع کی، جو کچھ ملا، پڑھ ڈالا۔ ہر عنوان پر ہر قسم کی کتابیں پڑھیں۔ اس آوارہ خوانی کا نہایت ہی خطرناک نتیجہ برآمد ہوا۔ خدا اور آخرت پر سے یقین اٹھتا چلا گیا۔ تشکّک اور ارتیاب سے ایمان و ایقان کی بنیادیں منہدم ہو گئیں۔ خدا کا وجود سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تمام دینی عقائد لغو اور غیر منطقی نظر آتے تھے۔ ایک ڈیڑھ سال تک یہی کیفیت رہی۔

"مولانا، کیا یہ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" مَیں نے حیرت و استعجاب کے عالم میں پوچھا۔

مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ انھوں نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں میرے چہرے پر جما دیں۔ مَیں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔

"تمھیں یہ بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

مَیں گھبرا اٹھا مگر مولانا حالی کے اس شعر نے گھبراہٹ کو عقیدت میں تبدیل کر دیا:-

تقاضائے محبت ہے وگرنہ ۔۔۔ مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

مَیں نے عالمِ شوق و جستجو میں دریافت کیا:

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

مولانا نے بڑے پُرسکون لہجے میں جواب دیا:

"تذبذب و تشکیک کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ عربی زبان پر خاصا عبور حاصل تھا۔ مَیں نے قرآن اور حدیث کا براہِ راست مطالعہ شروع کیا۔ حقائق و معارف کھلتے چلے گئے۔ بے یقینی کا غبار دُھلتا گیا۔ مَیں نے دُوسرے ادیان کی کتابوں کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا۔ ادیان

کے تقابلی مطالعے نے مجھے ایک گونہ اطمینان عطا کیا۔ دراصل اب میں نے اسلام سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا۔ مجھے اس کی حقّانیت پر کامل یقین تھا۔"

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے مولانا کی نگاہوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو گئی تھی جیسے عرفان کا ہلکا ہلکا نور عینک کے سپید شیشوں میں سے جھانک رہا ہو۔

"مولانا، اسلام کے پورے نظامِ حیات کو اس کے اصلی خدوخال اور وسیع مفہوم کے ساتھ سمجھنے میں قرآن و حدیث کے علاوہ آپ کو اور کونسی کتابوں نے مدد دی؟"

"ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں نے میرے ذہن کو پختہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔"

اسی موضوع پر میں نے ایک اور سوال کیا۔

"اسلام کے موضوعات پر کتابیں لکھنے کا خیال آپ کے ذہن میں کیونکر آیا؟"

مولانا ایک منٹ کے لئے خاموش رہے اور پھر اپنے دوہرے جسم کو جنبش دیتے ہوئے کہنے لگے:

"اسلام کے موضوعات اور مسائل پر لکھنے کا خیال دو باتوں کی بناء پر پیدا ہوا۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں شدھی تحریک کا بانی سوامی شردھانند ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہوا جس پر اسلام کے دشمنوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور انہوں نے مسلمانوں اور اسلامی تعلیمات کے خلاف الزامات کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ جذبۂ قومیت نے مجھے ان بہتان تراشیوں اور دشنام طرازیوں کے خلاف لکھنے پر اکسایا۔ انہی دنوں مولانا محمد علی جوہر جامع مسجد دہلی میں جمعے کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ میں بڑی باقاعدگی سے ہر جمعے ان کی تقریر سننے کے لیے آتا تھا۔ ایک جمعے کے خطبے میں مولانا نے فرمایا: "اس وقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اسلام کے صحیح تصوّرِ جہاد پر ایک مبسوط کتاب لکھے جس میں جہاد کے خلاف اٹھائے ہوئے تمام اعتراضات اور الزامات کے مدلّل جوابات دیئے گئے ہوں۔" میں نے دورانِ تقریر ہی میں یہ فیصلہ کر لیا کہ میں جہاد کے موضوع پر کتاب لکھوں گا۔

اس طرح اس کام کا آغاز جذبۂ قومیت سے ہؤا لیکن آگے چل کر یہ جذبہ اسلام کی وسعتوں میں جذب ہو کر رہ گیا۔"

مولانا محمد علی جوہر کا ذکر آیا تو مَیں نے ان کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرنے کے لیے سوال کیا:

"مولانا، آپ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے بارے میں کیا تأثر رکھتے ہیں؟ ایک طبقے کی رائے ہے کہ وہ سادگی سے گاندھی جی کے فریب کھاتے رہے"۔

مودودی صاحب نے دُکھ کے ایک گہرے احساس میں ڈوبتے ہوئے جواب دیا:

"ایک شخص کے مرنے کے بعد آپ جو چاہیں اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں، لیکن درحقیقت مولانا محمد علی جوہر مسلمانوں کے لیے سب سے گہرا درد رکھتے تھے۔ مَیں سمجھتا ہوں اس کے بعد اس قدر سچّا دینی جذبہ رکھنے والا لیڈر پیدا نہیں ہؤا۔ انھوں نے غلطیاں کی ہوں گی، لیکن مَیں نے بہت ہی کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جو اسلام کے لیے اِتنا گہرا اخلاص رکھتے ہوں۔ یہ اِن جیسے لوگوں ہی کے کردار کا اثر تھا کہ کسی کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کے شعائر کا احترام اور ان پر عمل پیرا ہُوئے بغیر سیاسی لیڈر بن سکے"۔

مَیں نے دل میں سوچا کتنا اچھا تھا وہ دَور جو بیت گیا۔ آج معاملہ بالکل اُلٹ ہو چکا ہے ــــ "سیاستدان" کہتے ہیں: "بھلا سیاست کا دین سے کیا تعلق ہے۔ ایک متدیّن اور مُتقی شخص کو سیاست کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ "سیاست کے چھینٹے" اس پاکباز انسان کے صاف ستھرے لباس کو داغدار بنادیں"۔

بڑے بڑے لوگ اس بات کو اب اتنے زور اور بلند آہنگی کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ ذہن اس فلسفے کو معقول اور صحیح سمجھنے لگا ہے ع۔ انقلابات ہیں زمانے کے

مَیں نے سوچنا بند کر دیا اور سوالات کرنے شروع کر دیئے:

"مولانا، دین اور مذہب میں کیا فرق ہے؟"

"شریعت میں مذہب کا لفظ مکتب خیال (SCHOOL OF THOUGHT) کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، لیکن دین سے مُراد وہ پُورا ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جو خدا اور اس کے رسُول نے ہمیں دیا ہے۔"

نظامِ زندگی کے الفاظ نے میرے رہوارِ فکر کو ذرا مہمیز لگائی اور میں نے فلسفیانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مولانا سے دریافت کیا:

"زندگی مسلسل متحرک ہے۔ یہ بڑھتی، گھٹتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ اس کے اندر بے پناہ لچک ہے۔ اگر اسلام ایک نظامِ زندگی ہے تو کیا اس میں بھی لچک موجود ہے؟"

مولانا نے بے ساختگی کے انداز میں کہا: "اس میں وہ فطری لچک موجود ہے جس کا تقاضا زندگی کرتی ہے۔ اجتہاد اسی لچک کا دُوسرا نام ہے۔ اجتہاد کے ذریعے سے اسلام زندگی کے ہر گُلِ تازہ کی آبیاری کرتا ہے اور ہر نئے اُبھرنے والے گوشے کو روشنی فراہم کرتا ہے، مگر اب اسلام میں اجتہاد کو متضاد مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے"۔

یہ کہہ کر مودُودی صاحب کچھ سوچتے ہُوئے رُک گئے اور میں نے اس وقفے میں سوال کیا:

"مولانا، وہ متضاد مقاصد کیا ہیں؟"

"اجتہاد کا ایک مقصد تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو نئے حالات پیش آئیں، ان پر اسلام کے اصول اور احکام منطبق کیے جائیں۔ دُوسرا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ مخصوص نظریات اور خواہشات ذہن میں پہلے سے موجُود ہوں، ان کے مطابق اسلام کو ڈھالا جائے۔ پہلی قسم کا اجتہاد صحیح معنوں میں اجتہاد ہے اور ہر دَور میں علماء اس اجتہاد کے قائل رہے ہیں، لیکن مؤخرالذکر اجتہاد نہ تو اسلامی اصطلاح کے مطابق اجتہاد ہے اور نہ کوئی مسلمان اس اجتہاد کا قائل ہے۔ غضب یہ ہے کہ اجتہاد کا نازک کام آج کل وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں جو اس کام کے سرے سے اہل ہی نہیں۔ اجتہاد کے لیے خاص قسم کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کی ضرورت ہے"۔

مولانا اپنی فراخ اور کشادہ پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رُکے۔ ہاتھ کی جنبشیں بتا رہی تھیں کہ ان کے جذبات میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو چلا ہے۔

"مولانا، اجتہاد کے لیے کس نوعیت کی صلاحیتیں درکار ہیں؟ آخر ہر شخص اجتہاد کیوں نہیں کر سکتا؟" میں نے بات کو آگے بڑھانے کے لیے سوال کیا۔

"اس کام کے لیے بہت سی صلاحیتیں درکار ہیں، لیکن کچھ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد کے لیے مغربی قوانین، معاشیات، اقتصادیات کا علم کافی ہے اور انگریزی ترجموں سے قرآن پڑھ کر اور حدیث، فقہ کو بالائے طاق رکھ کر بڑی کامیابی سے اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کا اجتہاد کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس کے دل میں خدا کا ذرا بھی خوف ہو یا جو اخلاص کے ساتھ مسلمان رہنے کا خواہشمند ہو۔ صحیح معنوں میں اجتہاد کا اہل وہ شخص ہو سکتا ہے جو عربی زبان میں مہارت رکھتا ہو، زبان کی نزاکتوں کو سمجھ سکتا ہو، قرآن کو اس کی اصل زبان میں نہ صرف سمجھنے کے قابل ہو بلکہ اپنی عمر کا غالب حصّہ تدبّر اور فہمِ قرآن کی نزاکتوں میں صرف کیا ہو۔ حدیث پر وسیع نگاہ رکھتا ہو، فقۂ اسلامی کی تاریخ اور اس کے اصول اور مختلف ادوار کے فقہاؑ کے کام سے واقف ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وقت کے مسائلِ زندگی پر بھی نگاہ رکھتا ہو۔"

"مولانا" میں نے جوش انگیز لہجے میں سوال کیا۔ "اگر ایک گروہ دوسرے قسم کا اجتہاد کرنے لگے اور اسے ملک میں نافذ کرنے پر بھی مُصر ہو، تو پھر قوم کو کیا کرنا چاہیئے؟"

مولانا نے نہایت پُرسکون اور ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا:

"پوری قوّت سے مزاحمت کرنی چاہیے، کیونکہ اس گروہ کا طرزِ عمل لازمی طور پر ملک کو انتشار اور تباہی کے گرداب میں پھینک دے گا۔ یہ مختصر سا مغرب زدہ گروہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آگیا ہے، ایک نیا دین قوم پر زبردستی ٹھونستا رہے گا اور قوم اس کو دفع کرنے کے لیے زور لگاتی رہے گی اور اس کشاکش میں ترقی کے راستے پر ہمارا قدم ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکے گا۔ ترکی اس کا تجربہ کر چکا ہے اور اس تجربے کے بُرے نتائج وہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہیں۔ اب پاکستان بھی آنکھیں

بند کر کے اسی راستے پر چلنے لگا ہے۔ انجام پہلے ہی سے صاف نظر آرہا ہے"۔

مَیں انجام کے بارے میں سوچ کر کانپ اٹھا۔ یاس کی کہر نے میرے ذہن کو ڈھانپ لیا۔ اتنے میں اُمیّد کی ایک کرن نظر آئی۔ عالمِ اشتیاق میں اس کی طرف لپکا اور اس کی روشنی میں مولانا سے ایک اور سوال کیا:

"کیا ان حالات میں علماء پر بھاری ذمّہ داری عائد نہیں ہوتی؟"

مولانا قدرے توقف سے بولے:

"مجھے آپ کے جذبات کی شدّت کا احساس ہے، مگر یہ تو سوچیے کہ علماء اسی سوسائٹی ہی کے تو فرد ہیں جس کی اخلاقی حس قریباً قریباً مر چکی ہے۔ ایسے معاشرے میں حق گو، جرأت مند باضمیر اور ایثار کیش علماء کہاں سے آئیں۔ اگرچہ علماء کا طبقہ دوسرے طبقوں کی نسبت اب بھی کئی اعتبار سے بلند ہے لیکن دین کے لیے جان کی بازی لگانے کا جذبہ بڑی حد تک سرد پڑ چکا ہے۔ کم ہمّت معاشرے میں یہ جذبہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا"۔

میری گردن ندامت سے جُھک گئی۔ ہم نے علماء کو دیا ہی کیا ہے جس کے عوض ہم ان سے قیمتی چیز کی توقع رکھیں۔ نہیں، نہیں ہم نے انہیں بہت کچھ دیا ہے۔ افلاس دیا ہے، مہذّب گالیاں دی ہیں اور انہیں سب سے گھٹیا معیارِ زندگی دیا ہے . . . . ان کے علاوہ انہیں اور کیا چاہیے؟ میرا دل بھر آیا۔ کیا علماء اسی سلوک کے مستحق ہیں؟

رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے مَیں نے قدرے مختلف موضوع پر سوال کیا:

"کچھ ماہرینِ قانون کی رائے ہے کہ چونکہ سزاؤں کے تعیّن کے بارے میں فقہا میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں، اس لیے اسلام کا تعزیراتی نظام قابلِ عمل نہیں۔ فرمائیے آپ کے تاثرات کیا ہیں؟"

مولانا پان کو دانتوں سے چباتے ہوئے کہنے لگے:

"اگر آپ کوئی کام نہ کرنا چاہیں تو اس میں ہزاروں کیڑے ڈال سکتے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی بات

تو یہ ہے کہ ہم اس بات پر اتفاق کریں کہ ہم اسلام کا قانونِ تعزیرات رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کے قانونِ تعزیرات کی بنیادیں ـــــ قرآن مجید کے احکام، رسُول اللہ کے ارشادات اور خلافتِ راشدہ کے نظائر ہیں۔ فقہاء کے درمیان اختلافات کی نوعیّت ویسی ہی ہے جیسی اِس زمانے میں قانون دان اور ججوں میں اختلافات ہوتے ہیں، باوجُود اس کے کہ قانون ایک ہے۔ اگر یہ اختلافات موجودہ زمانے کے قانون پر عمل کرنے میں مانع نہیں، تو قدیم زمانے کے قانون دانوں اور قاضیوں کے درمیان جو اختلافات ہُوئے ہیں وہ آخر اصل قانون کو نافذ کرنے میں کیسے مانع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اصل قانون یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اب اختلافات جو ہو سکتے ہیں وہ اس میں ہو سکتے ہیں کہ چور کی تعریف کیا ہے؟ کس حالت میں ایک شخص کو اس چوری کا مرتکب قرار دیا جائے جس پر شارع نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے؟ اس کے لئے کیا شہادت ملنی ضروری ہے؟ کونسا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ کس جگہ سے کاٹا جائے گا؟ ان امور میں جتنے اختلافات بھی ہیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر فقیہہ نے اصل قانون کے الفاظ اور عہدِ نبوی اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے نظائر سے اپنی رائے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اور جو کچھ جس کے نزدیک ثابت ہُوا ہے، اس کو اس نے اپنی فقہ میں درج کیا ہے، ان چیزوں کا جو شخص بھی باقاعدہ علمی مطالعہ کرے گا، اس کو محسوس ہو جائے گا کہ جس طرح ان مآخذ سے قدیم زمانے میں قانون اخذ کیا جا سکتا تھا، اسی طرح آج بھی کیا جا سکتا ہے اور جب تک کوئی شخص اس اصل قانون کے مآخذ سے استنباط کر رہا ہے، اس کا اجتہاد اسلام کے دائرے ہی میں مانا جائے گا۔ مغربی تہذیب اور اس کے تصوّرات سے مغلوب لوگ جب قدیم فقہائ کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں اور "اجتہاد" کی باتیں کرتے ہیں، ان کا اصلی مدعا اسلامی قانون سے فرار ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگوں کے اجتہاد کو ہم کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں۔ اجتہاد کی اوّلین شرط یہ ہے کہ آدمی اسلام کو سچّے دل سے حق مانتا ہو اور اخلاص کے ساتھ اس کی پیروی کا ارادہ رکھتا ہو۔ جن "صاحب" میں یہ بنیادی شرط ہی نہیں پائی جاتی وہ اگر اجتہاد کریں گے تو اسلام کے قانون کو مسخ کریں گے۔"

موضوع کو بدلنے کے لیے میں نے ایک دُوسری نوعیت کا سوال کیا:

"یہ بین الاقوامیت کا دَور ہے۔ اس عہد میں مختلف تہذیبوں کا ایک دُوسرے پر اثر انداز ہونا بالکل فطری امر ہے۔ ان حالات میں اگر ہم مغربی تہذیب سے مصالحت (ADJUSTMENT) کر لیں، تو کیا حرج ہے؟"

"تہذیبوں" کے میل جول سے فعالیت اور انفعالیت کا عمل ضرور شروع ہو جاتا ہے یعنی ایک تہذیب اثر ڈالتی ہے اور دُوسری تہذیب اثر قبول کرتی ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان دو صورتوں میں سے کونسی صورت ہمارے لیے قابلِ قبول ہے۔ تہذیبیں برابر کی سطح پر رہ کر کبھی سفر نہیں کرتیں۔ ایک تہذیب غالب ہوتی ہے اور دُوسری مغلوب۔ اس عمل میں کوئی درمیانی راہ موجود نہیں۔ اگر ہم اپنی تہذیب کو غالب رکھنا چاہتے ہیں، تو پھر ہمیں "مدافعت" کی سوچ بچار کے بجائے جارحانہ قدم اٹھانا ہو گا۔ وہ قومیں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتیں جو اپنی حفاظت کے لیے اپنے چاروں طرف قلعے تعمیر کر لیتی ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اسلامی تہذیب میں دنیا کی غالب تہذیب بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب اس کا انحصار مسلمانوں پر ہے کہ وہ اسے غالب تہذیب بنانے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ کوئی غیور اور آزاد قوم تہذیب کے معاملے میں کبھی سمجھوتہ نہیں کرتی، قوم کی تہذیبی انفرادیت ختم ہو گئی، تو پھر اس میں باقی ہی کیا رہ گیا؟ اور جو لوگ اپنی تہذیب کو چھوڑ کر دوسروں کی تہذیب کو اپناتے ہیں، ان کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ کی نہیں"۔

تہذیب کی بات چھڑی، تو مجھے ثقافت اور کلچر کا خیال آ گیا۔ اس لفظ نے دانشوروں اور مفکروں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس لیے مَیں نے کلچر کو موضوعِ گفتگو بنانا ضروری سمجھا۔ اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے مولانا سے مخاطب ہوا:

"آپ جب اسلامی ثقافت کے متعلق کچھ کہتے ہیں، تو منفی رَویّہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں چیزیں اسلامی ثقافت میں داخل نہیں۔ آپ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اسلامی ثقافت میں کیا کیا داخل ہے اور اس کے تفصیلی خدوخال کیا ہیں؟"

مولانا نے میرا سوال بغور سُنا اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا:

"بات یہ ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے لیے کچھ حدود مقرر کر دیتا ہے کہ انسانی آزادی کو ان حدود میں محدود رہنا چاہیئے۔ حدود ہمیشہ منفی ہوتی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ حدود میں فقط یہ بتا دیا جاتا ہے کہ صرف یہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد جو ممنوع نہیں، وہ مباح ہے۔ ان حدود میں رہتے ہوئے ایک فرد اپنے حسنِ ذوق کے اظہار اور نشو و نما کے لیے راہیں تلاش کر سکتا ہے۔ اسلام نے انسان کے فطری داعیوں اور تقاضوں پر قدغن نہیں لگائی بلکہ صحت مند نشو و نما کی راہیں متعیّن کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی شریعت نے حیوانوں اور انسانوں کی تصاویر کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اب اس کے معنی یہ نہیں کہ آرٹ کا ارتقاء بند ہو گیا، بلکہ مسلمانوں میں جو حسن کاری کا جذبہ تھا اس نے تصویر کا راستہ چھوڑ کر خطاطی، نقش گری، پچی کاری اور ایسے ہی دوسرے راستے اختیار کر لیے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان راستوں میں مسلمانوں نے آرٹ کے جو کمالات دکھائے ہیں وہ کسی طرح بھی مجسمہ سازی کے کمالات سے کم تھے یا ان میں حسن کاری نہ تھی۔ ایسا ہی دوسرے میدانوں میں ہوا۔"

تصویروں کے بارے میں میرے ذہن میں بیک وقت کئی سوالات اُبھر رہے تھے۔ میں نے ان سوالات کو ایک سوال میں مدغم کرتے ہوئے مولانا سے دریافت کیا:

"بعض تصویریں اپنے رنگوں کے امتزاج اور فن کار کے خونِ جگر کی آمیزش کے باعث نظر کو بالیدگی اور تازگی بخشتی ہیں۔ کیا اسلام ان کی بھی اجازت نہیں دیتا؟"

مولانا نے مسکراتی ہوئی نظریں مجھ پر جماتے ہوئے جواب دیا:

"جی نہیں، اسلام جو حدود قائم کرتا ہے، وہ اتنے واضح ہیں کہ ہر صاحبِ نظر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ میں اس کے آگے نہیں جا سکتا۔ تصویر کو ایک مرتبہ جائز کرنے کے بعد پھر کوئی خط کسی مقام پر بھی نہیں کھینچا جا سکتا کہ اس نوعیت کی تصاویر جائز ہیں اور اس نوعیت کی نہیں۔ ایک شخص عورت کی ننگی تصویر کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے اس کی روح کو بالیدگی ملتی ہے۔ یوں تو

پھر آپ کو عریانی کے تمام مظاہر کو جائز قرار دینا ہوگا۔

مَیں نے دل ہی دل میں کہا کہ مولانا بھی کمال کرتے ہیں۔ آخر عریاں تصویر میں حرج ہی کیا ہے۔ ان تصویروں سے ذوق نکھرتا ہے، بزنس چمکتا ہے، اشتہارات دیدہ زیب نظر آتے ہیں۔ ہوٹلوں اور دکانوں کا حُسن بڑھتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ شاہراہوں کے چوراہے ان تصاویر کی آرائش سے پیرس کے چوراہے نظر آتے ہیں۔ تو کیا مولانا اسلام کے نام پر ہم سے یہ سب کچھ چھین لینا چاہتے ہیں۔ ہم "نوجوانوں" کا کیا بنے گا؟ یہ کائنات بے رنگ ہو جائے گی۔

خیالات کے گردابِ تُند سے اُبھرتے ہوئے میں نے مولانا سے ایک اور سوال کیا:

"کیا اسلامی ریاست میں سینما کو اصلاحی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے گا؟"

"سینما کی موجودہ شکل تو بہت ہی اخلاق سوز اور تباہ کن ہے۔ وہ یوں کہ فلم کمپنیاں سُودی قرض سے سرمایہ حاصل کر کے کام آگے بڑھاتی ہیں۔ سرمایہ دار کا سُود اور اپنا نفع، دونوں چیزیں حاصل کرنے کے لیے وہ مجبور ہوتی ہیں کہ ایسے فلم بنائیں جو افیون اور شراب کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچیں۔ یہ فلم لامحالہ جنس یا جرائم سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ ایسے ماحول میں جو فلم اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے بنائے جائیں گے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اسلامی ریاست اصلاحی اور تعلیمی مقاصد کے لیے سینما استعمال کر سکتی ہے۔ فلم کو اگر صحیح طور پر استعمال کیا جائے، تو ایک دیہاتی کے معیارِ معلومات کو گریجوئیٹ کے معیار تک لایا جا سکتا ہے، لیکن یہ کام اسی وقت سرانجام پا سکتا ہے جب آنکھوں سے پلائی جانے والی شراب کو بند کیا جائے۔ اب جو ٹیلی ویژن آ رہا ہے اس نے اور بھی قیامت ڈھا دی ہے۔ مغربی ممالک میں بسا اوقات تو ایسا ہُوا ہے کہ ایک بڑے بچے نے قتل کا منظر دیکھ کر چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا۔ جو مناظر پہلے فلم سکرین تک محدود تھے، اب وہ گھر بیٹھے دیکھے جا سکتے ہیں"۔

مولانا بات کرتے کرتے رُک گئے۔ ان کا لہجہ غم اور دردمندی کے جذبات میں ڈوبتا ہوا

محسوس ہوا۔ وہ تاریخ کے جھروکوں سے ماضی اور حال کا مشاہدہ کرتے ہوئے مستقبل کے اُبھرتے ہوئے دھیمے نقوش دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے یقین و وجدان کی الم آمیز کیفیت کے ساتھ کہنا شروع کیا:

"آج پوری انسانیت دو چیزوں کی وجہ سے تباہی کے قریب آتی جارہی ہے۔ ایک سُودی کاروبار اور دوسری خاندانی منصوبہ بندی۔ ان دونوں باتوں نے انسان کو بہت ہی گھٹیا حیوان بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایک نے اُسے مادّیت کا غلام بنایا اور دوسری نے جنسی خواہشات کا۔ مجھے دُکھ ہے کہ یہ دونوں بلائیں میرے ملک کی طرف بڑھ رہی ہیں اور انہیں ہم خود خوشی خوشی لارہے ہیں۔"

مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ مولانا بھی جذبات رکھتے ہیں، مگر ان جذبات میں توازن تھا اور یہی توازن ان کے جذبات کو شورش کی آماجگاہ بننے سے روکتا ہے۔

لیکن میرا سینہ جذبات کا محشرستان بنا ہوا تھا۔ میں نے سنبھلتے ہوئے نئے سوال کے لیے الفاظ جمع کرنے کی کوشش کی۔

"زندگی میں آسائش و زیبائش پیدا کرنے کے لیے اسلام ایک فرد کو کس حد تک جانے کی اجازت دیتا ہے؟"

مولانا نے کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان استعمال کرتے ہوئے کہا:

"اسلام نہ آسائش کا مخالف ہے اور نہ زیبائش کا۔ حدود میں رہتے ہوئے آپ زندگی میں یہ دونوں باتیں پیدا کر سکتے ہیں۔ دراصل اسلام ضرورت کے پیمانوں کے مطابق آپ کو تمام مباحات استعمال میں لانے کی اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ آپ کے طرزِ عمل سے اسراف اور کبر نہ ٹپکتا ہو۔ ضرورت کے لیے آپ دو منزلہ کوٹھی بھی بنوا سکتے ہیں اور اگر فی الواقع ضرورت ہو، تو دروازوں پر پردے بھی ڈال سکتے ہیں لیکن اگر آپ بلا ضرورت صرف نمائش کے جذبے کے تحت زندگی پُر تکلف کے قیمتی غلاف چڑھانے لگیں، تو اس عمل کو اسلام پسندیدگی کی نظر سے

نہیں دیکھا:"

" لیکن، مولانا، یہ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جب انسان آسائشوں میں زندگی بسر کرنے لگے، تو پھر اس میں دین کے لیے جدوجہد کرنے کا احساس اور جذبہ بتدریج کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم ان آسائشوں سے احتراز کریں؟"

مولانا سوال سُن کر ایک منٹ کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر فکر آمیز متانت کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئے:

"نہیں، الطاف صاحب، یہ مناسب نہیں۔ اسلام میں جو حدود مقرر ہیں ہم ان میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ اصول کی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان مباح چیزیں استعمال میں لانے کا پورا پورا حق رکھتا ہے، لیکن کسی ایک فرد کو اگر مباح چیز اسلام سے دُور لے جائے، تو وہ اس کے لیے ممنوع قرار پاتی ہے۔ مثال کے طور پر کوٹ اور پتلون کی کریز ٹوٹنے کا خیال اگر کسی کو نماز ادا کرنے سے باز رکھتا ہے، تو یہ لباس اس کے لیے ممنوع قرار پائے گا۔ آسائشوں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ زندگی کی آسائشیں، مسرتیں اور جائز لذتیں ہمارے ہی لیے ہیں، لیکن اگر یہ ہمیں اسلام کے راستے سے ہٹانے کا سبب بنتی ہیں، تو انہیں ٹھکرا دیجیے۔ اس بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ اگر انسان کے معتقدات پختہ ہوں، تو یہ چیزیں اثر انداز نہیں ہُوا کرتیں۔ جس شخص کے سامنے مقصدِ زندگی ہے، اس کے لیے اصل چیز آسائش نہیں، بلکہ اصل چیز اس کا مقصدِ زندگی ہی تو ہے۔ آسائشیں جب تک مقصدِ زندگی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں، وہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جس وقت حائل ہونا شروع ہو جاتی ہیں، وہ لات مار دیتا ہے جب آسائشوں اور مقصدِ زندگی میں تصادم ہو جائے، تو پھر آسائشیں اس پر حرام ہو جاتی ہیں۔"

مولانا کی بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہم میں سے اکثر و بیشتر کا مقصدِ زندگی آسائشوں کا حصول ہے اور جب ان آسائشوں پر ذرا سی بھی آنچ آنے لگتی ہے، تو

پھر یا ہم معتقدات کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں یا ذرا تجدّد پسندی سے کام لیا، تو ان معتقدات کو تاویلوں کے ذریعے آسائشوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ اس کے علاوہ اس حقیقت سے بھی اغماض نہیں برتا جا سکتا کہ ایئر کنڈیشنڈ بنگلوں میں رہنے والے جہاں ایک طرف غریبوں اور عوام کی زندگی کے مسائل سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور ان کی ایثار کیشی دھندلا جاتی ہے وہاں دوسری طرف ان کی آسائشوں کی فہرست میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر ایک مقام یہ آتا ہے کہ وہ معیارِ انسانیت (STANDARD OF HUMANITY) کے بجائے معیارِ زندگی (STANDARD OF LIFE) بلند کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور یہی ان کی زندگی کا مقصود قرار پاتا ہے۔

مولانا کے اس فقرے نے مجھے چونکا دیا:

"قریشی صاحب، آپ کس گہری سوچ میں ہیں؟"

مَیں گھبرا اٹھا جیسے چوری کرتا ہوا پکڑا گیا ہوں۔ پسینے کے قطرے پیشانی پر ابھر آئے۔ انہیں رومال سے پونچھتے ہوئے حضرت مولانا سے ایک نئے موضوع پر سوال پوچھا۔

"عالمِ اسلام میں ایک انتشار اور شکست خوردگی کی کیفیت پائی جاتی ہے، اس کے بڑے بڑے اسباب کیا ہیں؟"

"یہ تو ایک بڑی ہی طویل داستان ہے۔ اسے اس موقع پر کیونکر دہرایا جا سکتا ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد کہنے لگے:

"دراصل انتشار کی بڑی وجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم معاشرے کی قیادت ایک مدّتِ دراز سے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو اسلام کو ماننے کے باوجود اپنے آپ کو اسلام کے حدود میں رکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قیادت کا ایک حصّہ علمائ، فقہائ، اور صوفیا کے ہاتھوں میں رہا، مگر اس نے صرف بریک کا کام دیا ہے۔ گاڑی چلانے والی لیڈر شپ دنیا پرستوں کے ہاتھ میں رہی اور اسی نے بگاڑ کو یہاں تک پہنچایا ہے۔ جب تک گاڑی کو

چلانے والی لیڈر شپ دیندار اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آئے گی۔ اس وقت تک یہ حالت نہیں بدل سکتی۔ بعض مسلمان ملکوں میں تو حالت یہ ہو گئی ہے کہ بریک ٹوٹ چکا ہے اور ڈرائیور گاڑی کو بگٹٹ نشیب کی طرف لے جا رہے ہیں اور اکثر مسلمان ممالک میں بریک کمزور پڑ چکے ہیں۔"

آہ! جن گاڑیوں نے کبھی بلندیوں کو سر کیا تھا، آج وہ نشیب کی طرف لڑھک رہی ہیں اور ہم تماشائی کی حیثیت سے یہ سارا منظر دیکھ رہے ہیں اور ہم میں احساس کی ذرا سی بھی خلش پیدا نہیں ہوتی۔

میں نے پہلو بدلتے ہوئے مولانا سے سوال کیا،

"اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے کیا کوئی "متحدہ" کوشش نہیں کی جا سکتی؟"

مولانا نے یاس اور اُمید کے ملے جلے جذبات اپنے لہجے میں سموتے ہوئے جواب دیا:

"متحدہ کوشش سر دست تو صرف اس حد تک ہو سکتی ہے کہ مختلف مسلمان ملکوں میں دینی رُوح کو بیدار کرنے والے لوگ کام کرتے رہیں اور جب کبھی موقع ملے تو ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے فائدہ اُٹھاتے رہیں۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لیے اس وقت کے بین الاقوامی حالات بالکل اجازت نہیں دے رہے۔ تمام مسلمان ممالک پر ایسے لوگ مسلط ہیں جو ایک طرف مغربی نیشنلزم کے تصوّرات کی پیروی کر کے اپنے اپنے ملکوں کو مضبوط فولادی سرحدوں میں محصور کیے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے کوئی بین الاقوامی مسلم تحریک نہیں چل سکتی اور دوسری طرف وہ مغربی تہذیب و تمدّن کو اپنے ملکوں میں رواج دے رہے ہیں اور اس طرح اسلامی تحریکوں کے راستے میں سخت رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔

رابطۂ عالمِ اسلامی کی تازہ کانفرنس جو جدّہ میں ہوئی اس سے کچھ توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ دراصل حج کے دنوں میں پورے عالمِ اسلام کے مدبّرین اور علماء کو سر جوڑ کر مل بیٹھنے کا سب سے موزوں موقع میسّر آتا ہے۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اس سے فائدہ نہیں

اٹھاتے۔ باہمی ربط سے بے شمار فوائد وابستہ ہیں جن کی بدولت کام کی ان گنت راہیں نکل سکتی ہیں
اس وقت عالمِ اسلام کو سب سے زیادہ ضرورت ایسے لٹریچر کی ہے جو اُٹھنے والے مختلف مسائل
کا نہایت صاف، معقول اور قابلِ عمل حل پیش کر سکیں۔ اس سلسلے میں ہم اپنے لٹریچر کو عربی میں
منتقل کر رہے ہیں۔ اس اقدام کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ کچھ ممالک کی درس گاہوں میں
بعض کتابیں نصاب میں داخل ہو گئی ہیں اور بحیثیت مجموعی یہ وہاں کے نوجوان بالخصوص انگریزی یافتہ
طبقے کو متاثر کر رہی ہیں۔ ان کتابوں میں عرب نیشنلزم پر بھرپور تنقید کی گئی ہے اور شاید یہ اسی کا اثر
ہو کہ عرب ممالک میں عرب قومیت کے خلاف تحریک اُٹھ رہی ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہی
تحریک آگے چل کر اسلامی تحریک کے لیے راستہ ہموار کر دے۔"

مولانا بات ختم کر چکے، تو میں نے اسی موضوع پر ایک اور سوال کر دیا:

"آپ نے عرب ممالک کی سیاحت کی ہے۔ آپ کے خیال میں کیا اس سرزمین سے کسی
اصلاحی اور جمہوری تحریک کے اُٹھنے کی توقع نہیں؟"

مولانا نے جواب میں فرمایا:

"وہاں کے حالات کے اعتبار سے اس وقت کسی جمہوریت کے قائم ہونے کے امکانات
روشن نہیں۔ تقریباً تمام عرب ممالک میں آمریتیں قائم ہیں۔ عراق، سوڈان اور مصر میں آمریت ہے
تیونس بھی قریب قریب آمریت کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے۔ اُردن، مراکش اور لیبیا میں
بادشاہی نظام قائم ہے۔ شام میں جمہوریت سر اُٹھاتی ہے اور فوجی آمریت اسے بار بار پچھاڑ دیتی ہے
جمہوریت اس وقت عرب ممالک میں کہیں بھی نہیں۔ سیاسی رقابتوں کی بنا پر ایک ملک
دوسرے ملک میں جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ جمہوریت کا علمبردار خود اپنے
ملک میں آمریت چلا رہا ہوتا ہے۔ تمام مسلم ممالک کا قریب قریب یہی حال ہے کہ ان ملکوں کی
فوجیں اپنے اپنے ملک کو فتح کر کے قبضہ جمائے بیٹھی ہیں۔

عالمِ اسلام پر تفصیلی گفتگو کے بعد پاکستان کے مسائل زیرِ بحث آئے۔ میں نے پاکستان کے بارے میں متعدد سوالات کیے اور یہ میرے سوالات کی آخری کڑی تھی۔

"آپ کے نزدیک اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ کیا ہے اور اسے کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟"

مولانا نے محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے جواب دیا؛

"میرے نزدیک پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ تقریباً وہی ہے جو تمام مسلم ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آخر کار لیڈر شپ آیا اسلام کو ماننے، سمجھنے اور اخلاص کے ساتھ اس پر عمل کرنے والوں کے ہاتھ میں آتی ہے یا ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں رہتی ہے جو اسلام کا نام لیتے ہوئے یا کھلم کھلا اس کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی قوم کو بگٹٹ غیر اسلامی راستے پر لے جانا چاہتے ہیں۔ اگر مستقبل قریب میں اس مسئلے کا فیصلہ پہلی صورت کے حق میں نہ ہوا، تو مجھے اندیشہ ہے کہ سارے مسلم ممالک سخت تباہی سے دوچار ہوں گے۔ بدقسمتی سے بیشتر مسلم ممالک میں جو لیڈر شپ قائم ہے وہ کسی عنوان بھی مسلم عوام کے ضمیر سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ حکومتیں اگر سو برس بھی زور لگائیں تو بھی میں توقع نہیں رکھتا کہ وہ مسلم عوام کے عقائد اور ان کے تصورات، تہذیب و تمدن اور ان کی اخلاقی قدروں کو تبدیل کر سکیں گی۔ اور میں یہ بھی توقع نہیں رکھتا ہے کہ مزید سو برس میں وہ کسی دوسری تہذیب کی قدروں اور تصورات پر قوم کی سیرت تعمیر کر سکیں گی۔ اس کشمکش کا حاصل اس سے زائد کچھ ہوتا نظر نہیں آتا کہ مسلمان قوم کی کوئی سیرت اور کردار نہ بن پائے اور اخلاقی اعتبار سے وہ بالکل دیوالیہ ہو جائے اور کوئی مادی ترقی بھی نہ کر سکے۔ ایک بے سیرت قوم، خواہ کتنے ہی ذرائع اور وسائل رکھتی ہو، درحقیقت کوئی مادی ترقی نہیں کر سکتی اور کسی حکومت کی کوئی پالیسی خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی ایسی صورت میں کامیاب نہیں ہو سکتی جبکہ پوری قوم کا ضمیر پورے اطمینان کے ساتھ اس کے ساتھ نہ ہو۔ اس لیے میں یقین رکھتا ہوں کہ تمام مسلمان ملکوں کے مستقبل کا تمام تر انحصار صرف صحیح

اور مخلص اسلامی لیڈرشپ پر ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ قیادت میسّر نہ آئی، تو ہم سب کو بہت ہی بُرا دن دیکھنا پڑے گا۔"

"اس لیڈرشپ کو تیار کرنے کے لیے کس شعبے میں اصلاح درکار ہے ؟" میں نے مولانا سے استفسار کیا۔

"لیڈرشپ کسی ایک شعبے میں نہیں اُبھرا کرتی۔ اس کو زندگی کے ہر شعبے میں ظاہر اور نمایاں ہونا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مسلمان ملکوں میں جمہوری نظام کو نشوونما پانے کا موقع مل جائے، تو بالکل ایک فطری ارتقاء کے طور پر مسلمان ملکوں میں اسلامی لیڈرشپ اُبھر آئے گی۔ مغرب زدہ طبقہ ہر مسلمان ملک میں بہت ہی محدود اقلیت رکھتا ہے، لیکن مغربی استعمار کی بدولت یہ اقلیت اقتدار کی وارث بن گئی ہے۔ یہ طبقہ اس بات کو جانتا ہے کہ اگر ان ملکوں میں جمہوریت کو کام کرنے کا موقع ملا، تو آخرکار اقتدار ان لوگوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اس لیے یہ طبقہ سازشوں کے ذریعے آمریت قائم کر رہا ہے اور جمہوریت کو اُبھرنے کا موقعہ نہیں دیتا۔"

"لیکن مولانا، مسلمان جمہور خود اسلام کے راستے سے بُہت دور ہیں۔ انہیں اسلام سے جذباتی لگاؤ تو ہو سکتا ہے مگر غالباً تربیت کی کمی کی وجہ سے ان میں وہ جوہر نظر نہیں آتا جو اسلامی لیڈرشپ کو جنم دے سکے، تو پھر جمہوری نظام قائم کرنے سے صالح قیادت کیسے بروئے کار آسکے گی ؟"

مولانا نے ایک متفکر کے سے انداز میں جواب دیا،

"ان دونوں کی حالت میں ایک بنیادی فرق ہے۔ عوام کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ اگرچہ ان میں جہالت بھی بہت پھیلی ہوئی ہے لیکن ان کی قدریں نہیں بدلیں۔ کسی بُرے سے بُرے بدکردار آدمی سے آپ بات کریں، تو تھوڑی دیر بعد آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ اس کی قدریں (VALUES) ابھی وہی ہیں جو ایک مسلمان کی ہونی چاہئیں اور اپنی تمام بدکرداریوں کے متعلق اسے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بُرا کر رہا ہے۔ بُرائی کو بھلائی کہنے والے آدمی عوام میں آپ کو

بہت ہی مشکل سے ملیں گے۔

اس کے برعکس مغرب زدہ طبقے کی قدریں (VALUES) تبدیل ہو گئی ہیں۔ ان کا فلسفۂ زندگی بدل گیا ہے۔ اسلام جن چیزوں کو بُرا کہتا ہے وہ انہیں اچھا سمجھتے ہیں اور اسلام جن چیزوں کو نیکیوں سے تعبیر کرتا ہے ان کی کوئی وقعت ان کی نگاہ میں نہیں رہی۔ اسلامی روایات سے وہ منحرف ہو چکے ہیں بلکہ ان کی نگاہوں میں ان روایات کے لیے کوئی احترام نہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں میں جو پروفیسر تعلیم دے رہے ہیں، اُن میں سے اکثر اس خیال کے حامی ہیں کہ تاریخ انسانی میں مسلمانوں نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ ایسے استاد بھی ہماری درس گاہوں میں موجود ہیں جو فرائڈ کے نظریات کے مطابق انبیائے کرام اور ہمارے رسُولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کی تصریح فرماتے ہیں۔ اونچے سرکاری مناصب پر ایسے لوگ رکھے جاتے ہیں جو شراب اور سُود کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رقص و سرود کو اسلامی تہذیب و ثقافت قرار دیتے ہیں، ان لوگوں کے عقائد اور عوام کے درمیان کوئی بھی مماثلت نہیں۔ اگر اقتدار اسلامی ذہنیت رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہو تو مسلمان عوام کو صرف چند برسوں میں بالکل تبدیل کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے رگ و ریشہ میں اسلامی تصورات اور اقدار موجود ہیں۔ صرف اُن کو اُبھار کر عملی شکل میں لانے کی ضرورت ہے۔"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا:

"مولانا، خدا کرے! آپ کا حسنِ ظن درست ہو۔ حالات تو کچھ اور ہی اشارے کر رہے ہیں۔"

مولانا نے شفقت اور امید میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

وقت زیادہ ہو چکا تھا۔ ہم نے مولانا سے اجازت لی۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھے۔ جو ٹھہراؤ، شفقت کی نرمی اور زندگی کی حرارت مولانا کے چہرے سے ٹپک رہی تھی وہی ہاتھ میں جذب تھی۔ واقعی تعمیری کاموں کے لیے انہی کی ضرورت ہے۔

مولانا سے اَن گنت سوالات کرنے کے بعد ایک سوال مَیں نے اپنے آپ سے کیا:

"تم ان لوگوں کے زُمرے میں تو نہیں آتے جو اسلام کو مانتے ہوئے اس کے حدود میں رہنے کے لیے تیار نہیں؟"

سوال ڈائریکٹ تھا۔ اس کی تندی اور تلخی کی تاب نہ لا سکا۔ مَیں بوکھلا اُٹھا۔ بے حسی کے سحر نے جاگے ہوئے ضمیر کو یہ کہہ کر سُلا دیا کہ اس نوعیت کے سوالات کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ ایسی باتیں بڑھاپے میں اچھی لگتی ہیں۔

جوانی کی شمشیرِ خارا شگاف نے احتساب کی تلوار کو کُند کر کے رکھ دیا اور مَیں سوچنے لگا: نامعلوم روزانہ اس طرح کتنی تلواریں کُند ہوتی ہوں گی اور کتنے ضمیر بے حسی کی نیند سو جاتے ہوں گے ؟